تسہیل

عاقبۃ الانکار

از افادات: مصلح الامت مرشد الملت العالم الکامل والعارف الواصل حضرت الحاج الصوفی الشاہ صفی اللہ مرشدنا ومولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری رحمہ اللہ

حسب ایماء داعیِ اسلام حضرت مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب دام اللہ فیوضہم

تحقیق وتہذیب، تسہیل وتبویب

عمران علی مظاہری

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ دارالعلوم منہاج الدعوۃ الہیڑی

باہتمام: سعید الظفر

ناشر:

مکتبہ شاہ ولی اللہ بٹلہ ہاؤس دہلی

تفصیلات

نام کتاب:-تسہیل عاقبۃ الانکار وارشاد الحیران

مؤلف:-حضرت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ

صفحات:-۸۸

سائز:-A5

حسب ایماء:-داعی اسلام حضرت مولانا محمد کلیم صدیقی حفظہ اللہ ورعاہ

تبویب وتسہیل:-عمران علی مظاہری

اشاعت:-مئی ۲۰۰۴

ناشر: مکتبہ شاہ ولی اللہ، بٹلہ ہاؤس دہلی

باہتمام: سعید الظفر

تحقیق وتہذیب: ادارۃ البحوث الاسلامیہ دار العلوم منہاج الدعوۃ الہیڑی

قیمت:-

فہرست عنوانات

تفصیلات ۲
مقدمہ....خاکم بدہن ۷
کوچۂ غمخوار میں چل، تمہید ۱۵

عاقبۃ الانکار

قصوروار کون؟ ۱۹
شیخ آئینہ ہے ۲۰
سب مریدوں کا کامل ہونا شرط نہیں ۲۱
عقیدت وخلوص ضروری ہے ۲۲
شرائط واصول ۲۵
نفاق اور بے ادبی کا انجام ۲۶
خود بینی ۲۹
خادم ہی مخدوم بنتا ہے ۳۰
سچے طالب کی ضرورت ۳۱
پیرِ کامل کی تلاش ۳۲
شیخ نوری کا ارشاد عالی ۳۴
مشائخ پر اعتراض کون کرتا ہے؟ ۳۵
مشائخ کے افعال کی تاویل ۳۶

ایک مثال ۳۸
مشائخ اوران کے پیروکار ۳۸
فرقت کی ابتدا ۴۰
ایک واقعہ ۴۰
دوسرا واقعہ ۴۱
منکر کا جوتا ۴۲
بیعت کی حقیقت ۴۴
شیخ کا انتخاب ۴۵
اس راہ کے اصول ۴۶
اکلِ حلال ۴۷
حسنِ اخلاق ۴۸
صحبت ودوستی ۴۹
ڈھیل ۴۹
مردار دنیا ۵۱
نفع کیوں نہیں ہوتا؟ ۵۳
پہلا قدم سچی طلب ۵۳
ناواقفی کا اثر ۵۶
بداعتقادی کیوں ہے؟ ۵۸
مورشیوہ ۵۹

اونٹنی اور منافقین ۶۱
ایک غلط فہمی ۶۲
کیفیات کا ذمہ دار ۶۳
جہالت یا ہوشیاری؟ ۶۵

ارشاد الحیران، معروف بہ تلاش مرشد

اللہ تعالیٰ کی طلب ۶۷
حیرت کی دو قسمیں ۶۷
بے نیازی، تری عادت ہی سہی ۷۰
مناجات کی تاثیر کا واقعہ ۷۲
مناجات کی تاثیر کا دوسرا واقعہ ۷۳
برا خیال ۷۵
شیخ کامل کے حصول کا دوسرا طریقہ ۷۶
شیخ کی ذمہ داری ۷۸
کرامات ۷۹
کرامت ضروری نہیں ۸۰

عاقبۃ الانکار

مقدمہ

سندی ومرشدی حضرت مولانا محمد کلیم صدیقی دامت برکاتہم

خاکم بدہن

احسن الخالقین رب کائنات نے اپنی شاہ کار تخلیق انسان کو اپنی سنت کے مطابق روح اور جسم سے مرکب بنایا، اس نے دار الامتحان اس دنیا میں انسان کو بھیج کر اس کے جسم و روح دونوں میں صحت ومرض دونوں کی صلاحیت اور گنجائش رکھی، جسم میں مرض پیدا کرنے کے لئے طرح طرح کے جراثیم اور امراض کے ذرائع پیدا فرمائے، تو ساتھ ہی ہر مرض کی دوا پیدا فرما کر اس کے علاج کے اسباب بھی بتائے۔

اپنے بندوں میں سے بعض بندوں کو خاص صلاحیتیں عطا فرما کر انسان کے جسم کے امراض کو جانچنے، پرکھنے اور ان کے علاج کی تدبیریں بھی سجھائیں، اور جس طرح جسم میں پیدا ہونے والے امراض کے لئے دوائیں پیدا فرما کر اپنے خاص بندوں کو امراض اور بیماریوں کی وجوہات اور ان کی دواؤں کے خواص اور ان کا طریقہ علاج سمجھایا، بالکل اسی طرح بلکہ اس سے دو چند، انسان کے جسم سے کہیں زیادہ حساس حصہ، روح میں بھی امراض وصحت کے امکانات رکھے، اور روح کو امراض اور رذائل سے پاک کر کے صحت منداور پاکیزہ رکھنے کے لئے پہلے ہی روز سے اس سلسلہ میں رہنمائی کرنے والے، محترم افراد انبیاء پیدا فرمائے، روح چونکہ جسم کے مقابلہ میں بہت لطیف، پاکیزہ اور حساس ہے، اس کی حد درجہ حساسیت کی وجہ سے روحانی امراض کی رہنمائی اور علاج کے سلسلہ میں

انسانوں کے لئے ادنیٰ غلطی بہت خطرناک ثابت ہوسکتی تھی، اس لئے رب کریم نے روحانی علاج اور طریقہ علاج کو انسانی عقل وشعور کا مرہون منت نہ چھوڑ کر، جس میں غلطی کا بہت امکان تھا، اپنی طرف سے اس سلسلہ میں انسانیت کی رہنمائی کے لئے آسمانی صحیفے اور کتابیں نازل فرمائیں، اور چونکہ انسانی فطرت کی کمزوری اور بڑی ضرورت ہے کہ اپنی زندگی کے ہر موڑ پر صرف کتابیں اور ان کی رہنمائی کافی نہیں، بلکہ انسان کو اپنی زندگی کے تمام مرحلوں میں چلنے کے لئے عملی نمونہ کی ضرورت ہے، اس کے لئے صرف کتابیں کافی نہیں، بلکہ آگے چلنے والے اور چل کر بتانے والے رہنما افراد کی ضرورت ہے،، اس لئے ابتدائے آفرینش سے سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کو صحیفہ عطا فرمانے کے ساتھ خود نبی بنایا، اور یہ سلسلہ ذہبی مسلسل چلتا رہا، یہاں تک کہ خاتم الانبیاء نبی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ سلسلہ ختم ہوا، نبوت کا سلسلہ اپنی خاص حکمت کی وجہ سے ختم فرمایا تو انسانی ضرورت کے لحاظ سے نبی رحمۃ للعالمین کے جانشین، سچے پیرو اور اس چشمۂ صافی سے فیض پانے والے علماء ربانیین کا سلسلہ جاری فرمایا۔

انسان کا جسم بیمار ہوتا ہے، اسے چھوٹے بڑے امراض کا عارضہ ہوتا ہے، تو اس کو اپنی صحت کی حفاظت کا، اور اگر بیمار ہوجائے تو اس کو اپنے علاج کی فکر اور کوشش کا مکلف بنایا، انسان کی فطرت ایسی بنائی کہ اگر چہ فن طب اور میڈیکل سائنس کی کتابوں میں کل امراض، ان کو پہچاننے کے آثار اور ان کے علاج کے طریقے لکھے ہوتے ہیں اور سارے اطباء ان کو پڑھ کر ہی طبیب بنتے ہیں، مگر کوئی طبیب بھی اگر بیمار ہوتا ہے تو اس کو صحت حاصل کرنے کے لئے کسی ماہر طبیب کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، بالکل اسی طرح روحانی امراض وعلاج کے سلسلہ میں رہنمائی اور باطن کے تزکیہ کے لئے سب کچھ قرآن و

حدیث اور دینی کتابوں میں موجود ہے،مگر پھر بھی اس کو اپنے رذائل اور روحانی امراض کے علاج اور تزکیۂ باطن کے لئے روحانی اطباء کی ضرورت ہے،اور الحمدللہ چودہ سوسال سے آج تک ایسے اطبائے روحانی اور علمائے ربانی اور مشائخ اس امت میں موجود رہے ہیں،جو خلق خدا کی رہنمائی اور ان میں تعلق پیدا کرنے کے لئے رہنمائی فرماتے رہے ہیں۔

سنت اللہ یہ ہے کہ رب کریم نے اپنی کائنات کو نظم ونسق سے چلانے کے لئے اس کائنات میں کچھ اصول وضوابط اور اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے کچھ آداب طے کئے ہیں، رب کائنات نے انسان کے باطن کا تزکیہ اور اس کی روح کی بیماری دور کرکے اس کو صحت مند بنانے کے لئے اپنے خاص بندوں پر اس راہ کے اسرار،اور اصول وآداب بھی کھولے ہیں،جس کو اس مبارک فن کی اصطلاح میں سلوک کہتے ہیں،ان اصول وآداب کو بجالائے بغیر انسان کو اپنے ہدف کو پالینا سنت اللہ کے مطابق ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

امت میں نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر آج تک،ایک خلق کثیر ان مربیان عظام اور علمائے ربانین سے،اپنے باطنی تزکیہ کے لئے تعلق قائم کرکے اپنی منزل تک پہنچی اور آج تک یہ مبارک سلسلہ رہا ہے۔

باطن کو رذائل سے پاک کرکے نفس وروح کا تزکیہ اور تعلق مع اللہ حاصل کرنے کے جو اصول وآداب علمائے ربانین نے بتائے ہیں،اور جن پر اطبائے اہل باطن کا اجماع رہا ہے ان میں سے ایک اہم اصول کو ان کی اصطلاح میں ''توحید مطلب'' کہا جاتا ہے،جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے حالات ،مناسبت اور سہولت کا لحاظ کرکے مختلف مشائخ اور صاحب سلسلہ بزرگوں میں سے خوب سوچ سمجھ کر مناسبت،محبت اور اپنی حالت پر خوب

غور کر کے کسی ایک روحانی طبیب اور شیخ و مرشد سے آدمی وابستہ ہو جاتا ہے، اور پھر اس کے ساتھ مردہ بدست زندہ بن کر اپنے کو سپرد کر دیتا ہے، اور بقول شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ ''ارادت کا مزافٹ بال بن جانے میں ہے،'' اور پھر'' یک در بگیر محکم بگیر'' کا مزا حاصل ہوتا ہے۔

اس لئے علمائے ربانین اور مشائخ تصوف نے اس راہ کے لئے چار چیزوں کو ارکان اربعہ قرار دیا ہے، اطلاع، اتباع، اعتقاد، انقیاد۔

اطلاع کا مطلب یہ ہے کہ اپنے حال کی اطلاع کرتا رہے، شیخ کو عالم الغیب سمجھنا سخت غلطی ہے، اس لئے اپنے حال کی مسلسل اطلاع اور رابطہ ضروری ہے، اس کے بعد حالات کی اطلاع کے بعد شیخ و مرشد جو تجویز فرمائیں اس کی اتباع کی جی جان سے کوشش کرے اور اس میں کسل و سستی ہرگز نہ کرے، تیسری چیز اعتقاد ہے، دل میں یہ اعتقاد راسخ رکھے کہ میرا شیخ و مربی پوری دنیا کے سارے مشائخ اور بزرگوں میں میرے لئے سب سے زیادہ انفع ہے، اس اعتقاد کے ساتھ در بدر چکھور یا بن کر دیکھنے کے بجائے بس اپنے شیخ سے یکسو ہو کر وابستہ رہے۔

زمانہ قریب کے اس راہ کے عبقری شہ سوار اور راز دار، مجدد ملت، حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے، ایک طرف حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، اور حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی تشریف رکھتے ہوں، اور دوسری طرف ہمارے مرشد و شیخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تشریف رکھتے ہوں تو ہم حضرت حاجی صاحب سے ہٹا کر ایک نظر بھی ان بزرگوں پر نہیں ڈالیں گے، اسی کو توحید مطلب کہتے ہیں، اسکے لئے دو باتوں پر اعتقاد اور اعتماد ضروری ہے، شیخ کی عقل پر اور شیخ کی خیر خواہی پر۔

چوتھی چیز انقیاد ہے، کہ مرید اور مسترشد کے لئے شیخ جو علاج تجویز کرے اسے علی وجہ البصیرت سب سے بہتر سمجھ کر بے چوں و چرا اس پر عمل کرے، اس سلسلہ میں بعض مشائخ نے برائے تمثیل یہ بات کہی ہے کہ اگر شیخ یہ کہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر مجھ سے نکاح کر دے، تو مرید اس کو اپنے لئے دارین کی خیر خواہی سمجھ کر شیخ کی تجویز پر اعتماد کرے۔

مقصد اس مثال کا یہ ہے کہ بظاہر یہ حکم عقل و شعور اور دل پر کتنا شاق اور کریہہ دکھائی دیتا ہے، مگر مرید کو شیخ پر اتنا اعتماد ہو کہ اسے اتنے اہم فیصلہ پر بھی تکدر نہ ہو اور مرید اس فیصلہ کو بھی انشراح قلب کے ساتھ تسلیم کر لے۔

اور سلوک کے ان ارکان اربعہ کا بجالانا، اپنے شیخ کے ساتھ کمال یک سوئی کے ساتھ، تعلق، ربط اور اعتقاد کے بغیر جس کو تصوف کی اصطلاح میں توحید مطلب کہتے ہیں ممکن نہیں۔

خیر القرون سے بُعد کے ساتھ ساتھ خیر کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے، اور باطنی رذائل اور روحانی بیماریوں سے آلودہ ماحول میں انسان کو اپنے باطن کے تزکیہ کے لئے اب زیادہ محنت اور وسائل کی ضرورت ہے، اللہ کی راہ بتانے والے مشائخ اور اطبائے روحانی ابھی الحمدللہ دنیا میں موجود ہیں، مگر قرب قیامت کے اس دور میں جیسے جیسے مشائخ تسبیح کے دانو ں کی طرح بکھرتے جاتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں بھی انحطاط آتا جارہا ہے، اصلاح باطن اور تعلق مع اللہ کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ انسان کا نفس اور اس کی 'میں' اور انانیت ہے، اس راہ کے لئے خود کو مٹائے بغیر منزل ملنا ناممکن ہے، مگر عوام الناس کی بات تو دور، وہ لوگ جو اس راہ پر چل رہے ہیں اور ایک زمانہ سے مشائخ سے وابستہ رہے ہیں، ان کا حال بھی طلب حق کے لئے خود کو مٹانے کے جذبہ کے بجائے، اکثر و بیشتر ان مشائخ سے وابستگی میں، ان کے یہاں خصوصیت حاصل کرنے اور خود نمائی کے جذبہ کے علاوہ کوئی

مقصد ہی دکھائی نہیں دیتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ خود کو مٹانے کے لئے جس جذبہ اعتقاد و محبت کی ضرورت ہوتی ہے، وہ خود شیخ کے ساتھ نہیں ہوتی، بلکہ در بدر کے انتشار کی وجہ سے ایک درجہ اپنے شیخ کے ساتھ انکار اور عدم اعتقاد کی کیفیت رہتی ہے، اعتقاد اور انقیاد کے بغیر اطلاع و اتباع کی توفیق نہیں ہوتی، اس کی وجہ سے پچاس پچاس سال مشائخ سے وابستہ رہنے کے باوجود اپنے نفس اور انا کے غلام تیلی کے بیل کی طرح چکر لگاتے رہتے ہیں۔

اس راہ میں کچھ ترقی کرنے، اصلاح باطن اور تعلق مع اللہ کی دولت حاصل کرنے والوں کے لئے اس ذہنی اور فکری انتشار سے بچ کر اس راہ کے لئے سم قاتل اپنے شیخ کے ساتھ عدم اعتماد، یا کم اعتقاد، جسے تصوف کی اصطلاح میں ''انکار'' کہتے ہیں، سے بچنا ضروری ہے، جس کے ہوتے ہوئے اس راہ کا سفر ایک قدم بھی طے کرنا ممکن نہیں، ضرورت ہے کہ اس راہ میں کچھ کرنے اور تزکیہ وتصوف وسلوک کی راہ طے کرنے والوں کو اس موذی مرض سے باخبر کیا جائے۔

اس کے لئے ایک مرد درویش، اس راہ سلوک کے محرم راز بلکہ شہ سوار عارف باللہ، عالم ربانی حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی نے اس راہ میں بھٹکنے والے اور اس مرض سے بے خبر رہ کر ٹکریں مارنے والے لوگوں پر ترس کھا کر ایک رسالہ ''عاقبۃ الانکار'' کے نام سے تحریر فرمایا تھا، حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادی جب دارالعلوم میں طالب علم تھے، تو مرشد العلماء حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے فرمایا تھا:

دارالعلوم میں ایک عارف پڑھتا ہے۔

لوگوں نے نام پوچھا:

تو فرمایا: وصی اللہ۔

جس کو طالب علمی میں مرشد تھانویؒ سے سند ملی ہو، اس شخصیت کا مشیخیت کی مسند پر بیٹھنے کے بعد کیا مقام ہوگا؟

بڑی حسرت تھی کہ ایسی کوئی تحریر لوگوں کے سامنے آئے، اس رسالہ کو پڑھا تو دل چاہا کہ اس کو شائع کیا جائے، مگر اس زمانہ میں جب ہمتیں پست ہوگئی ہیں، اعمال میں سستی حد درجہ بڑھی ہوئی ہے، دینی، علمی صلاحیت میں اس قدر انحطاط اور زوال آ گیا ہے، کہ اچھے خاصے دینی گھرانوں میں مشکل، ادق اور فنی اردو الفاظ سمجھنے والے کم یاب ہو گئے ہیں، اس کے لئے اس حقیر نے اپنے جواں علم اور اس راہ میں جواں شوق رفیق محب گرامی مولانا محمد عمران مظاہری سے اس خواہش اور ضرورت کا اظہار کیا، انھوں نے بخوشی اس خدمت کے لئے ارادہ ظاہر فرمایا، وہ ہم سبھی کی طرف سے بہت مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس حقیر کی درخواست پر اس رسالہ کی تسہیل کا ارادہ کیا، اب وہ یہ مبارک تحفہ ملت کے ان خوش بختوں کی خدمت میں شائع کر کے پیش کر رہے ہیں، جن کو اس راہ پر چلنے اور اسے اپنی منزل بنانے کا شوق ہے۔ الحمدللہ مولانا نے یہ کام بڑے سلیقہ سے کیا، کافی وقت پہلے وہ یہ کام مکمل کر چکے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ لوگوں کو ان کی اس خدمت کا فیض پہنچے، اور یہ شائع ہو، اس لئے کہ اس میں انھوں نے اپنا وقت اور صلاحیت صرف کی ہے، ان کا اصرار تھا کہ یہ حقیر اس پر کچھ سطر لکیریں نکال دے، مگر اتنے بڑے عالم ربانی کی ایسی حساس پاکیزہ اور فنی موضوع پر شائع ہونے والی کسی تحریر پر کچھ پیوند لگانے میں اس گھسیارے کے لئے احساس کمتری مانع رہا، بار بار اصرار کے باوجود، اسفار کی کثرت کے بہانے زندگی کی بے نظمی کا عذر بھی تھا، مگر چونکہ اس حقیر کی خواہش اور درخواست پر انھوں نے یہ کام کیا ہے اس لئے راہ فرار کی کوئی شکل نہ نکلی، تو شریک اجر ہونے کے لالچ میں چند

لکیریں نکال دی ہیں، بلکہ اپنی زبان میں چند لکیریں کا ڑھی ہیں۔

یہ حقیر مولانا موصوف کو اس خدمت پر مبارک باد پیش کرتا ہے، رب کریم سے قوی امید ہے کہ **اس راہ میں طویل زمانہ سے ٹکریں مارنے کے باوجود ایک قدم آگے نہ بڑھ سکنے کی وجہ سے مایوس سالکین کے لئے یہ رسالہ مہمیز ثابت ہوگا**، اور ہمارے رفیق محترم مولانا عمران علی مظاہری کے لئے بھی ضرور انشاء اللہ ذخیرہ آخرت بنے گا۔

خاک پائے خدام دین

محمد کلیم صدیقی

پھلت ضلع مظفر نگر

۲۰ رصفر ۱۴۳۵ھ

۲۴ ردسمبر ۲۰۱۳ئ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کوچۂ غمخوار میں چل

الحمد للہ الذی کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی

اما بعد! دنیا ایک طویل عرصہ سے مادیت پر فریفتہ اور روحانیت سے غافل ہے، یہی وجہ ہے کہ جسم کی افزائش اور تنومندی کے لئے لوگ جگہ جگہ دوکانیں کھولے بیٹھے ہیں، کہیں ڈاکٹرس ہیں جنھوں نے لاکھوں اور کروڑوں خرچ کر کے نرسنگ ہوم اور ہاسپیٹل بنا رکھے ہیں، جو جسم کی بیماریوں پر نشتر لگاتے ہیں، تو کہیں جِم اور اکھاڑے ہیں جو جسم کی نشونما اور اسے کسرتی بنانے کے گر بتلاتے ہیں، ان دوکانوں کے آگے بھیڑ کا عالم یہ کہ بعض بعض کے یہاں کئی کئی دن بعد نمبر آتا ہے، لیکن بازار کی کسی لائن میں روح کا علاج کرنے والی کسی دوکان کا بورڈ آج تک نہیں دیکھا، کسی کو پوچھتے ہوئے بھی نہ پایا، وجہ اس کی صاف ہے کہ اس نازک اور حساس ترین حصہ کی جانب کوئی توجہ نہیں، اس کی کوئی اہمیت نہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اہل اللہ کو کہ انھوں نے اس جانب توجہ کی اور اللہ کے بندوں کی تڑپتی ارواح کی تسکین کا سامان کیا، روح کی بیماریوں کی علامات کو جانا اور ان کا علاج دریافت کیا اور اللہ کے لاکھوں کروڑوں بندوں کو نفس و شیطان کے پھندوں سے نکال کر ان کی عظمت پر قائم اور منصب حقیقی پر فائز کیا، صرف یہی گروہ ہے جو انسانیت کی حقیقی ضرورت کا سامان کرتا ہے، صرف یہی کوچہ ہے جہاں تمام انسانیت کی غمخواری کی جاتی ہے ، آ اے دل! اسی کوچہ میں چلیں!۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مشائخ کے یہ آستانے جہاں بیمار روح کی دوا ملتی ہے دنیا میں ہمیشہ سے کمیاب ہیں، اور جو ہیں وہ ناقدری اور بے اعتنائی کا شکار ہیں، ان کی جانب متوجہ

ہونے والے اول تو ہیں ہی بہت کم، پھران کم میں سے بھی انتہائی قلیل مقدار اپنے مقصد کو حاصل کر پاتی ہے، اس المیہ کے اسباب کی نشاندہی اس میدان کا کوئی شہسوار ہی کرسکتا تھا ، چنانچہ حضرت مولانا وصی اللہ الہ آبادی رحمہ اللہ نے انتہائی مختصر الفاظ میں اس مہلک بیماری کی نشاندہی فرمادی، جس نے لاکھوں کی روح کو گویا ڈس لیا ہے۔

راقم سطور خود ایسا ہی مبتدی ہے جسے جگہ جگہ ٹھوکروں اور رکاوٹوں سے سابقہ ہے، لہٰذا اس رسالہ کو جب مرشدی حضرت مولانا محمد کلیم صدیقی دامت برکاتہم نے تسہیل کے بہانے عنایت فرمایا تو اول تو اپنی نالائقی کی بنا پر بہت خوشی ہوئی، لیکن برادر کبیر جناب قاری مزمل نوید صاحب نے اس جانب توجہ دلائی کہ دراصل حضرت نے یہ کتاب اس لئے عنایت کی ہے کہ اسے پڑھ کر ہم اپنے دامن کے داغ دیکھ لیں۔ لیکن ؎

دامن میں داغ ہوں تو اسے دھو بھی لوں مگر
یاں صرف داغ داغ ہیں دامن نظر آتا نہیں

اب اسے پڑھا تو شرم سے پانی پانی ہوگیا، کتاب میں جو کچھ نظر آیا سب میرے حال پر صادق وناطق تھا، تسہیل تو کیا کرتا کہ یہ موٹی سی بات خود اپنی سمجھ میں نہ آئی تو اوروں کو اس راہ کی رمز یہ زبان کس طرح سمجھا سکتا ہوں؟ لیکن چونکہ میرے مرشد کا حکم ہے اس لئے چند الفاظ کے سہل ترجمے کر کے پیش کر دیئے ہیں، اللہ تعالیٰ بے حد جزائے خیر عطا فرمائے میرے حضرت کو کہ خیر خواہی کا حق ادا کر دیا، اب بھی اگر منزل نہ مل سکے تو حیف ہے۔

توحید مطلب کو مشائخ اصلاح کی کلید بتلاتے ہیں، یعنی یہ کہ اپنے شیخ کو اپنے لئے پوری دنیا میں سب سے زیادہ انفع سمجھے، راقم مدتوں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ اس کے معنی کیا ہیں، کیا اس سے دوسرے بزرگوں کی ناقدری یا انکار لازم نہ آئے گا؟

ہوسکتا ہے کہ مجھ جیسا کوئی ایک آدھ بے وقوف اور بھی ہو جو اس مخمصے میں گرفتار ہو، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی طبیب کسی بیمار کے نزدیک بھی ہو اور اس کے حالات سے بھی واقف ہو، وہ اس بیمار کا علاج اسکے مزاج کے موافق کرتا ہے، اس کی صحت کا خیال رکھتا ہے، خود اس کے نرم گرم کو جان لیتا ہے، اس کے چہرے سے اس کی پریشانی بھانپ کر اسے دور کرنے کی تدبیر کرتا ہے، یہ طبیب اس بیمار کے لئے دوسرے تمام اطباء سے زیادہ انفع ہے، ہوسکتا ہے کہ ملک میں بعض سقراط، بقراط اور ابن سینا اس سے بڑھ کر ہوں، مگر اس غریب کے لئے ان سقراطوں سے زیادہ نافع یہی طبیب ہے، اور اس سے دوسرے کسی طبیب کی حذاقت کی نفی لازم نہیں آتی۔

اہل اللہ کے اقوال اصطلاح کے دبیز پردوں میں چھپے ہوتے ہیں، ان کی اصل روح اور اصل معانی ومطالب کو وہی لوگ پوری طرح سمجھ سکتے ہیں جو اس جادہ سے کچھ تعلق رکھتے ہوں، تاہم راقم سطور نے کوشش کی ہے کہ کتاب کا مفہوم بھی پوری طرح سمجھ میں آجائے، اور اسی کے ساتھ اس کا تسلسل اور تاثر بھی قائم رہے۔

راقم السطور نے یہ کام اصلاً اپنی اصلاح کی نیت سے کیا ہے کہ شاید نفس کو اسی سے کچھ شرم آجائے کہ اس راہ کی ایک پاکیزہ اور معتبر تحریر پر کسی نہ کسی درجہ میں خود تیرا نام بھی موجود ہے، نیز امید ہے کہ دوسرے احباب کو بھی اس سے نفع ہوگا، اسی لئے راقم سطور کو اس کی اشاعت کی کوشش تھی، مگر حضرت داعیِ اسلام کے ایماء اور تحریری سند کے بغیر اس کو شائع کرنا نامناسب محسوس ہوتا تھا، حضرت کی عدیم الفرصتی اور کثرت اسفار کی وجہ سے اس تمنا کو یاوری میں کافی وقت لگ گیا، بہرحال اب حضرت داعی اسلام کی اجازت وایما سے یہ رسالہ شائع کیا جارہا ہے تاکہ ہم حرماں نصیبوں کی فلاح کا سامان بنے۔

اللہ تعالیٰ اسے اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، اوراس کے اندر تعاون کرنے والوں، حمایت وتائید کرنے والوں کو اپنی بارگاہ سے خوب خوب اجر وجزا عطا فرمائے، حضرت والا داعیِ اسلام مولانا محمد کلیم صاحب صدیقی مدظلہ العالی کو بطور خاص اپنی عنایات، فتوحات اور قبولیات سے نوازے، جو ہمیشہ اس عاصی کی پذیرائی فرماتے ہیں۔ آمین، اللھم آمین

عمران علی مظاہری

دارالعلوم منہاج الدعوۃ الہیڑی

۲۰ مارچ ۲۰۱۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عاقبۃ الانکار

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

قصوروار کون؟

اما بعد! آج کل مشائخ کے یہاں جو لوگ آتے جاتے ہیں اور ان سے نفع کی امید بھی رکھتے ہیں، جب ان کو نفع نہیں ہوتا تو اس کا قصوروار شیخ کو ٹھہراتے ہیں اور اس کو شیخ کا نقص اور اس کی ہی کمی جانتے ہیں، حالانکہ ان کا یہ خیال بالکل بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ تو اللہ والوں سے بدگمانی اور ان کی شان میں گستاخی ہے، جو ایک بہت ہی بری بدعت اور خطرناک گناہ ہے، میرا تو خیال یہ ہے کہ آج ہم پر جو پریشانیاں آرہی ہیں ان کی وجوہات میں سے یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نیک اور صالح بندوں پر اس قسم کے الزامات لگاتے ہیں حالانکہ یہ حضرات ان سے بالکل بری ہیں۔

ہم اس وقت اسی مسئلہ کے متعلق دلیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ لوگ اس خیال میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟ اور کیا واقعی یہ مشائخ کا ہی قصور ہے، یا خود ان ہی لوگوں کی اپنی کوتاہی اور نقص ہے، جس کو انکا نفس اور شیطان شیخ کے اندر دکھاتا ہے، اس موقع پر اس حکایت کا بیان کرنا مناسب اور حسب حال معلوم ہوتا ہے جو بخاری شریف کی شرح ''بہجۃ النفوس'' میں بعض محققین (حقیقت کو جاننے والے، صوفیاء) سے منقول ہے۔

شیخ آئینہ ہے

حکی عن بعض الفضلاء المحققین انه اتاه شخص یرید السلوک فدخله للخلوة وترکه أیاماً ثم دخل علیه وقال له کیف تریٰ صورتی عندک؟ فقال: صورة خنزیر فقال الشیخ صدقت ثم ترک فی خلوته أیاماً ثم دخل علیه وسئله مثل الأولی فقال: صورة کلب ثم کذالک إلی أن قال له صورة القمر لیلة کماله فقال له صدقت، ألأن کمل حالک وحینئذ أخرجه من الخلوة*[1]

کسی شیخ کامل ومحقق کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس کوئی شخص سلوک اور اپنی اصلاح کے ارادہ سے آیا، شیخ نے اس کو خلوت (تنہائی) میں رہنے کا حکم فرمایا، اور اس کو اسی حال پر کچھ دن چھوڑے رکھا، پھر ایک دن شیخ اس کے پاس خلوت میں تشریف گئے اور اس سے معلوم کیا کہ میں تجھ کو کیسا دکھائی دیتا ہوں، اس نے کہا کہ آپ مجھے خنزیر جیسے دکھائی دے رہے ہیں، شیخ نے کہا درست کہتے ہو، اور اس کو اسی طرح خلوت میں رکھتے رہے، کچھ دنوں کے بعد دوبارہ اس کے پاس گئے اور وہی پہلا سوال کیا کہ میری صورت تمہیں کیسی لگتی ہے، اس نے جواب دیا کہ اب آپ مجھے کتے کی شکل میں نظر آ رہے ہیں، الغرض اسی طرح شیخ اس سے تھوڑے تھوڑے وقت کے بعد دریافت کرتے رہے اور وہ ہر بار مختلف جواب دیتا رہا، یہاں تک کہ اس نے آخر میں یہ کہا کہ میں آپکو ایسا پاتا ہوں جیسا چودھویں رات کا چاند۔

شیخ نے یہ سن کر فرمایا کہ ہاں اب تمہارا حال درست ہو گیا ہے، اور پھر اس کو خلوت سے باہر نکلنے کا حکم دے دیا۔

---

[1] بہجة النفوس ۴۸

اس حکایت سے معلوم ہوا کہ مرید کے لئے شیخ آئینہ کی مانند ہوتا ہے، اور اس کو شیخ کے اندر خود اپنی شکل نظر آتی ہے، چنانچہ وہ بزرگ تو اول دن سے ہی بدرِ کامل تھے، لیکن خود مرید کے اندر تبدیلیاں ہو رہی تھی جن کو وہ شیخ کے اندر محسوس کر رہا تھا، جوں جوں اس کی اصلاح ہوتی گئی، حقیقت وسچائی کے قریب ہوتا چلا گیا۔

پھر یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ لوگوں کا ہجوم صرف مشائخ کے ہی پاس نہیں رہتا، بلکہ ان کے علاوہ بھی بڑے بڑے علماء اور فضلا موجود ہیں، ان کے پاس بھی بہت سے حضرات استفادہ اور فیض حاصل کرنے کے لئے جمع رہتے ہیں، تو کیا ان کے پاس سے ہر ہر شخص فاضل اور کامل ہی ہو کر نکلتا ہے؟

نہیں، بلکہ مشاہدہ تو یہ ہے کہ ان فارغین میں سے زیادہ لوگ کم استعداد بلکہ بالکل بے استعداد ہوتے ہیں، یہاں تک کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج علماء کی جگہ جہلاء نے لے لی ہے، اور الا ما شاء اللہ کوئی ہی کوئی ان میں سے کام کا ہوتا ہے، تو کیا یہاں یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ اساتذہ، محدثین اور فضلا ناقص ہیں؟ یا یہ کہا جاتا ہے کہ اساتذہ کا علم وفضل تو اپنی جگہ مسلم ہے، البتہ یہ خامی اور کوتاہی تو دراصل پڑھنے والوں کی ہے کہ وہ ایسے علماء اور فضلا کو پا کر بھی کچھ نہ سیکھ سکے۔

جب علومِ ظاہریہ میں یہ بات ہے اور سب کو تسلیم بھی ہے کہ بے شک علماء واساتذہ کا کوئی قصور نہیں ہے تو پھر علوم باطنہ کے معاملے میں ہی کیوں مشائخ کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے؟ یہاں بھی یہی کیوں نہیں سمجھ لیا جاتا کہ شاید یہ مرید کا ہی قصور ہے جس کی وجہ سے اس کو نفع نہ ہوا؟ شیخ اپنی جگہ پر کامل ومکمل سب کچھ ہے۔

سب مریدوں کا کامل ہونا شرط نہیں

کیا کسی شیخ کے کامل ہونے کے شرائط میں یہ امر بھی داخل ہے کہ اسکے سب کے سب مریدین کامل ہوں؟

یہ تو واقعہ کے بالکل خلاف بات ہے، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شیخ کامل ہو لیکن اس کے پاس آنے جانے والے اپنی خرابیوں کی وجہ سے اس کے فیض سے محروم ہوں، دیکھئے اکمل الکاملین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک زمانہ اور آپ کی صحبت پانے کے باوجود ابو جہل اور ابولہب جیسے لوگ محروم ہی رہے، اسی طرح منافقین بھی محروم رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ استفادہ کے لئے شرائط ہیں اور ان شرائط کا طالب علم کے اندر ہونا بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ استاذ میں، اور باطن چونکہ بہت ہی نازک چیز ہے اس لئے اس کی شرائط بھی بڑی نازک ہیں، باطنی فائدے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے اندر اسکی شرائط پیدا کرے، اور جو چیزیں نفع کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں ان کو دور کرے، اکیلے شیخ ہی کامل ہوکر کیا کرسکتا ہے؟ طالب کا بھی تو صادق اور مخلص ہونا ضروری ہے، اب اگر کوئی شیخ سے طریق کے شرائط کے ساتھ سیکھتا ہی نہیں ہے تو اس میں شیخ کا کیا قصور؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زمانے میں آخر کیوں اتنا فتور پیدا ہوگیا ہے اور لوگوں کی عقلوں پر کیسا پردہ پڑ گیا ہے کہ جس چیز کا خود اپنے روزمرہ کے ظاہری معاملات میں مشاہدہ اور اقرار کرتے ہیں، باطن کے معاملے میں اس کا انکار کیوں ہے؟ قصور اور نقص تو اپنا ہوتا ہے اور اسے تھوپتے ہیں شیخ کے سر، کیا یہ اسی کا مصداق نہیں ہے ع

خود فراموشی کند، تہمت دہد استاد را

کمی اپنی ہے اور تہمت استاد پر رکھتے ہیں۔

اور کیا ایسا کرنا مشائخ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی نہیں ہے؟ اور اہل اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ کر کے اللہ تعالیٰ سے فلاح و کامیابی کا طالب ہونا کہاں کی انصاف پسندی ہے ؟اس کا فیصلہ آپ خود ہی کر لیں۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بجائے مشائخ پر الزام رکھنے کے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے قصور کا اعتراف کرتے ،اور مشائخ کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی کوتاہیوں کو ان کے سامنے پیش کرتے ،اور ان کے حقوق واحترام کی مکمل رعایت کرتے ہوئے باطنی فائدے کی تمام شرائط اختیار کرتے ،اور موانع سے اجتناب واحتراز کرتے ، اس کے بعد ان کی جانب سے کسی قسم کے فیض اور نفع کے منتظر رہتے ،تب تو بے شک اپنے موقف پر حق بجانب تھے۔

میرا تو خیال یہ ہے کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں اس سے تمام مشائخ متفق ہونگے ، کیونکہ اس قسم کے آنے جانے والوں سے سارے ہی مشائخ نالاں ہیں اور کوئی بھی ان سے خوش نہیں ، بھلا کون نہیں چاہتا کہ اس کے مریدین اچھے ہوں ، اور ہم اللہ تعالیٰ کے حضور سرخرو ہوں ؟ مگر اس قسم کے لوگ ان کو چلنے نہیں دیتے ، ان کے خلاف طرح طرح کی باتیں کر کے لوگوں کو ان کی جانب سے بدظن کرتے ہیں ، اور اگر شیخ ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی تادیبی معاملہ کرتے ہیں یا ان کو اپنے پاس سے نکالتے ہیں تو یہ لوگ ان کو بداخلاق بھی بتاتے ہیں (إنا للہ و إنا الیہ راجعون)

عقیدت وخلوص ضروری ہے

حاصل یہ کہ اس طریق میں جس طرح شیخ کامل کی تلاش وجستجو ضروری ہے ، اسی طرح طالب کے دل میں ارادت وعقیدت اور خلوص ومناسبت بھی انتہائی ضروری ہے ، جس

طرح شیخِ کامل کے بغیر اس راہ کو طے نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح شیخ کامل کے موجود ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ارادت وعقیدت اور خلوص ومناسبت نہ ہونے کی بنا پر محرومی ہی ہاتھ آتی ہے، شیوخ کاملین نے جس طرح اس راہ میں شیخ کامل کا ہونا ضروری مانا ہے اسی طرح طالب کے اندر ارادت اور اس کے دوسرے لوازم کو بھی شرط قرار دیا ہے، چنانچہ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز خلیفۂ اجل امامِ ربانی حضرت مجدد الف ثانی جو کہ اپنے وقت کے ایکمانے ہوئے، بہت بڑے بزرگ اور اکابر میں گذرے ہیں، مکتوبات معصومیہ دفترِ سوم خط نمبر ایک سو اکیس میں فرماتے ہیں:

پس باعثِ سالک وسدراہِ او دریں طریق ہیچ نہ شد غیر از سستیٔ طالب، طالبِ صادق کہ در صحبتِ کامل افتد وشرائط طالب کہ اکابر قرار دادہ اند بجا آورد امید است کہ البتہ واصل گردد۔

یعنی طالب کی رکاوٹ کا سبب اور اسکی راہ کا روڑا خود طالب کی سستی کے علاوہ کوئی نہیں، جو طالب سچی طلب کے ساتھ کسی کامل کی صحبت اختیار کرے، اور اس راہ میں اکابر نے جو شرائط مقرر کئے ہیں ان کا پاس ولحاظ رکھے تو امید ہے کہ وہ واصل الی الحق ہو ہی جائے گا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کر لے گا)[1]

بوالہوس

اور اگر طالب کے اندر ارادت کے شرائط ہی پائے نہ جاتے ہوں تو یہ حضرات اس کو طالب ہی نہیں مانتے، بلکہ ہوس کا پجاری سمجھتے ہیں جیسا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے اپنے ایک خط میں منشی محمد قاسم صاحب کو یہ شعر لکھا تھا:

---

[1] مکتوبات معصومیہ جلد ۳ ص ۶۵۱

سعدیا کنگرۂ عشق بلند است بلند
دست ہر بوالہوس آنجا بہ فضولے نہ رسد

سعدیا! عشق کا کنگرہ بہت اونچا ہے، کسی خواہشات کے پجاری بوالہوس کا فضول ہاتھ اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ [1]

نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اپنے رسالہ قصد السبیل میں طالب کی شان اور طلب کے لوازم کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

طالب توبہ کے ساتھ آئندہ کے لئے بھی یہ عزم رکھے کہ اللہ ورسول کی اطاعت میں چاہے نفس کو کتنی ہی ناگواری ہو، اور مال یا جان کا کتنا ہی بڑا نقصان ہو اور چاہے کیسا ہی دنیاوی یا نفسانی فائدہ چھوٹتا ہو اور دنیا چاہے کتنی ملامت کرے برداشت کریں گے، مگر اللہ اور رسول کی اطاعت ہاتھ سے جانے نہ دیں گے، اگر اتنی ہمت نہیں ہے تو وہ سچا طالب نہیں ہے، بلکہ یہ بوالہوس ہے، کیونکہ طالب کی تو یہ شان ہوتی ہے:

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زر و گنج بصد حشمتِ قارون باشی
درره منزل لیلے کہ خطر ہاست بجان
شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اے دل تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تو شراب رنگین سے خراب ہو جا (تصوف کے رنگ میں رنگ جا) اور مال وزر کے بغیر حشمت میں قارون سے بھی بڑھ جا (دنیا سے ایسا بے نیاز ہو جا کہ گویا قارون سے بھی بڑا خزانہ رکھتا ہے) لیلیٰ کے کوچے کی راہ میں جان کو خطرہ

---

[1] مکتوبات یعقوبیہ ص ۱۰

ہے لہٰذا پہلے قدم کی ہی شرط یہ ہے کہ دیوانہ ہوجا۔(کیونکہ عقل وہوش قائم رہے تو جان نہیں دے سکے گا،لہٰذا دیوانہ ہوجا تا کہ آسانی سے جان دیکر،لیلیٰ کو حاصل کر سکے۔)

شرائط واصول

اب ہم اکابر کے تجربات اور تصریحات پیش کرتے ہیں تا کہ معلوم ہوجائے کہ منکر کے لئے محرومی اور ذلت لازم ہے،اور یہ بھی کہ طالبِ راہِ حق کے لئے کیا کیا امور ضروری ہیں، اور شیخ کامل کی طلب وتلاش کا کیا طریقہ ہے؟ اور طریق کے کیا شرائط واصول ہیں؟

چنانچہ اس طریق میں انکار کا تو گذر ہی نہیں،اس کے متعلق حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں کہ:

اگر آنجا انکار بود حرمان عظیم باشد، کہ منکر بجائے نہ رسد، جز مخذول ومطرود نبود، صاحب عوارف میگوید،من انکر ھم ضلّ و اعتدیٰ ومصدق اگر چہ بدرجۂ ایشاں نہ رسیدہ است امید است کہ تصدیقِ اورا درخدمت وصحبت ایشاں آرد اورا بکمال مرداں رساند وعارف سبحان گرداند[1]

اگر یہاں انکار ہوا تو بڑی محرومی ہوگی، کیونکہ منکر شخص کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا وہ تو سوا ذلیل وخوار ہونے کے کچھ اور پا ہی نہیں سکتا،صاحب عوارف المعارف فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ان حضراتِ اولیاء اللہ کا انکار کیا وہ گمراہ ہوا،اور اس نے حد سے تجاوز کیا اور ان حضرات کی تصدیق کرنے والا اگر چہ ان کے درجہ کو نہ پہنچے، پھر بھی امید ہے کہ ان حضرات کی خدمت وصحبت میں جس تصدیق کو لے کر وہ آیا ہے وہی اس کو درجۂ کمال تک پہنچادے،اور اللہ تعالیٰ کا عارف بنادے۔

---

[1] السنۃ الجلیۃ ص ۵۴

اور علماء نے بھی بیان فرمایا ہے کہ (تصدیق نہ کرنے والا، منکر) ترقی سے بھی محروم رہتا ہے، چنانچہ مجمع البحار میں ہے:

لا يقنع درجة من الدرجات إلا إحد الرجلين، أما غير مصدق لتلك النعمة الخطيرة أو سفيه لا يهتدى للتجارة المربحة* [1]

اس راہ میں کسی معمولی درجہ پر صبر دو ہی شخص کر سکتے ہیں، ایک تو وہ جو اس بڑی نعمت کی تصدیق ہی نہ کرتا ہو، (یعنی اسے اہمیت ہی نہ دیتا ہو، اور اسے کوئی ضرورت کی چیز ہی نہ جانتا ہو) اور دوسرا وہ جو ایسا بے وقوف ہو کہ نفع بخش تجارت سے ہی ناواقف و بے بہرہ ہو۔

راقم کہتا ہے کہ حضرت والا دامت برکاتہم فرمایا کرتے ہیں کہ یہ ''إما غير مصدق أو سفيه'' کا مطلب یہ ہے کہ اس ایک درجہ پر قناعت کرنے والے شخص میں ان دونوں باتوں میں سے ایک نہ ایک کا ہونا ضروری ہے، ان دونوں باتوں سے وہ خالی نہیں ہوسکتا، البتہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی شخص میں یہ دونوں اوصاف جمع ہوں۔

نفاق اور بے ادبی کا انجام

اکابر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انکار محرومی کا سبب ہوتا ہے، اسی طرح نفاق اور مشائخ کے ساتھ بے ادبی و گستاخی بھی اس طریق میں رکاوٹ ہے، جیسا کہ تحفۃ السالکین میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ سے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے:

حضرتِ ایشاں یعنی حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ اپنے پیر بزرگوار حضرت سید نور محمد بدایونیؒ کے متعلق نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے آپ کو آنحضرت کے مریدوں میں

---

[1] مجمع البحار ج ۱ ص ۶۴

بتا تا تھا، ایک دن اس نے بدبختی میں آ کر آنحضرت کے حضور میں سخت بے ادبی کی، اور بہت برا بھلا کہا، جس کے جواب میں آپ نے کچھ نہ فرمایا، دوسرے دن وہ شخص حاضر ہوا تا کہ آپ سے توجہ و استفادہ حاصل کرے، میں نے چاہا کہ اس کو سزا دوں، لیکن آنحضرت نے مجھ کو منع کیا، اور اس شخص پر اس طرح متوجہ ہوئے جس طرح دوسرے مخلصین پر توجہ فرمائی تھی، فقیر اس بات سے بہت تنگدل ہوا، اور اس کو تمام مخلصوں کے برابر سمجھنے کے باعث آنجناب کی خدمت میں عرض کیا، تو فرمایا ''مرزا صاحب اگر میں اس کو سرزنش اور ملامت کرتا اور توجہ نہ دیتا تو مجھ سے اللہ تعالیٰ پوچھتا کہ میں نے تیرے سینے میں ایک نور امانت رکھا تھا اور میرے بندوں میں سے ایک اس نور کو طلب کرنے آیا، تو نے اس کو کیوں محروم رکھا؟ تو اس وقت میں کیا یہ جواب دیتا کہ الٰہی اس آدمی نے مجھ کو گالی دی تھی، اس لئے میں نے اسے محروم رکھا؟ اور کیا یہ جواب مقبول ہوتا؟

کچھ مدت تک میں تنگ دلی کے ساتھ خاموش رہا، تھوڑے دنوں کے بعد آنجناب نے فرمایا کہ اے بچے اگرچہ میں نے اس کو مخلصوں کی طرح توجہ دی ہے مگر حق تعالیٰ منافق کو کب مخلص کے برابر جانتا ہے؟

واللہ یعلم المفسد من المصلح ★

اللہ تعالیٰ جانتا ہے فسادیوں کو بھی اور مصلحین کو بھی

کام کی حقیقت اللہ کے ہاتھ میں ہے، فیض صرف مخلص اور مؤدب دوستوں کو پہنچتا ہے، اسی قصے کی سی مثال ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول منافق جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بار بار بے ادبی کی تھی اسکے بیٹے نے جو کہ مومن مخلص تھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں درخواست کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسکے جنازے کی نماز پڑھائیں اور اس کے

لئے بخشش کی دعا مانگیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے جنازے کے لئے کھڑے ہوئے تو حضرت عمرؓ نے منع کرنا چاہا کہ یا رسول اللہ یہ وہی شخص ہے جس نے فلاں روز ایسا کہا اور فلاں دن ایسا کہا، اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

إن تستغفر لهم سبعين مرةً فلن يغفر الله لهم ★ (توبہ ۸۰)

یعنی اگر آپ ستر بار بھی منافقوں کے لئے مغفرت طلب کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو ہرگز نہیں بخشے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر کا کہنا نہ سنا اور فرمایا کہ میں اس کے لئے ستر دفعہ سے بھی زیادہ بخشش طلب کرونگا۔

آخرالامر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے لئے مغفرت بھی طلب کی ،مگر اس منافق کے حق میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے استغفار کو نامنظور فرمایا اور یہ آیت نازل ہوئی:

ولا تصلّ علىٰ أحد منهم مات أبداً ولا تقم علىٰ قبره ★ (توبہ ۸۴)

یعنی منافقین میں سے کسی کے لئے کبھی نماز جنازہ نہ پڑھئے اور اس کی قبر پر مت کھڑے ہوجئے!

پھر ایک اور آیت نازل ہوئی:

سواء عليهم استغفرت لهم أم لم تستغفر لهم ★ (منافقون ۶)

یعنی آپ منافقین کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں برابر ہے

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی منافق کے جنازے کی نماز نہیں پڑھائی۔[1]

---

[1] تحفۃ السالکین ص ۳۰

دیکھئے اس سے معلوم ہوا کہ نفع کے لئے اخلاص شرط ہے، فیض صرف مخلص کو ہوتا ہے، منافق و بےادب بزرگوں کے فیض سے محروم رہتا ہے۔

خود بینی

علماء کی تصریحات ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مشائخ کی بےادبی اور گستاخی محرومی کا سبب ہے اسی طرح ان کے سامنے تکبر، انانیت اور خود بینی بھی اس طریق میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، چنانچہ شیخ سعدیؒ نے ایک حکایت بیان فرمائی ہے، اوراس کی سرخی ہی یہ قائم کی ہے ''حکایت اندر محرمیِ خویشتن بیناں'' خود بینوں کی محرومی کی حکایت''

یکے در نجوم اندکہ دست داشت ــــ ولے کہ از تکبر سر مست داشت
سوئے کوشیار آمد از راہِ دور ــــ ولے پر ارادت سرِ پر غرور
خردمند از و دیدہ در دوختے ــــ بکش حرفِ خدمت بیا موختے
چو بے بہرہ عزم سفر کردہ باز ــــ بدو گفت دانائے گردن فراز
تو خود را گماں بردۂ برخرد ــــ انائے کہ پر شد دگر چوں پرد
ز دعوے تہی آ تا پر شوی ــــ تو از خود پری زاں تہی میروی
زہستی در آفاق سعدی صفت ــــ تہی گرد و باز آئے پر معرفت

ایک آدمی کو تھوڑا بہت علم نجوم آتا تھا، لیکن اسی کی بنا پر تکبر میں مست تھا، اس نے طویل سفر طے کیا اور ایک ماہر کے پاس پہنچا، دل میں ارادت تو تھی لیکن غرور بھی سر میں بھرا ہوا تھا، تو اس ماہر نے اس پر نہ کوئی توجہ کی اور نہ کوئی حرف اس کو سکھلایا، بالآخر جب اس نادان نے واپسی کا ارادہ کیا تو اس ماہر نے اس سے کہا کہ تو نے چونکہ اپنے آپ کو ماہر سمجھ رکھا تھا اس لئے خالی واپس جا رہا ہے، بھلا جو برتن پہلے ہی بھرا ہوا ہو اس کو کوئی کیسے بھرے گا، اپنے

گھمنڈ سے خالی ہوکر آ، تا کہ تجھ کو بھرا جا سکے، اور تو چونکہ خود پہلے سے پر ہے اس لئے خالی جا رہا ہے، اپنی ہستی کو سعدی کی طرح خالی کر دے تا کہ معرفت سے بھرا جا سکے۔

اس حکایت سے معلوم ہوا کہ جس ارادت (مریدی) میں تکبر و خود بینی (اپنے آپ کو کچھ سمجھنا) کی ملاوٹ ہو وہ سچی ارادت ہی نہیں ہے، جو اہلِ طریق کے نزدیک فیض کے لئے شرط ہے، پس ایسی ناقص ارادت کا ثمرہ بھی محرومی ہی ہے۔

خادم ہی مخدوم بنتا ہے

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید او محروم شد

یعنی جس شخص نے خدمت کی وہ مخدوم بن گیا اور جو خود بینی میں پڑ گیا وہ محروم رہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ خادم ہی ایک دن مخدوم بھی ہو جاتا ہے، پس مخدوم ہونے کا طریقہ یہی ہے کہ انسان پہلے خادم بنے، پھر وہ خدمت ہی اس کو مخدومیت کے مرتبے پر پہنچا دیگی اسی کو حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ:

ہر آنکس کہ گردن بفرماں نہد بسے بر نیاید کہ فرماں دہد

جو شخص اللہ کے حکم پر گردن جھکا دیگا تو زیادہ وقت نہیں گذرے گا کہ وہ حاکم بن جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ فرماں روائی فرماں برداری کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، یہی حال دوسرے کمالات کا ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج جو طالب ہے کل کو وہی مطلوب ہوگا، محب ہے تو محبوب ہو جائے گا، قابل ہے تو مقبول ہو جائے گا، اگر آج عاشق ہے کل کو معشوق ہو جائے گا، مرید ہے تو مراد ہو جائے گا۔

سچے طالب کی ضرورت

اسی طرح علماءِ فن نے یہ بھی تصریح فرمادی ہے کہ طالب کو راہِ حق کی طلب میں کیا کرنا چاہئے؟ چنانچہ شیخ العرب والعجم سیدنا ومولانا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے ایک دن کسی نے سوال کیا کہ طالبِ راہِ حق کو کیا کیا ضرورت ہے؟ فرمایا کہ اول کسی بھی چیز کے طالب کو لازم ہے کہ وہ اس چیز کی حقیت و ماہیت دریافت کرے، تاکہ دل میں اس کے حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہو، بس جو شخص کہ صوفیوں کی راہ پر چلنے کا ارادہ کرے اس کو چاہئے کہ پہلے تصوف کی حقیقت اور اس کی غرض وغایت (مقصد) معلوم کرے (تصوف کی غرض وغایت راہِ حق یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی ہے) اس کے بعد ان کے اعتقادات اور ظاہری وباطنی آداب کو سمجھے، خاص طور پر ان کے حال و قال اور تصنیفات میں جو الفاظ جن معانی میں آتے ہیں ان کو جانے اور ان کی اصطلاحات سے واقف ہو تاکہ وہ ان کے افعال واحوال اور احکام کی تابعداری کر سکے، کیونکہ جھوٹے مدعیان کی زیادتی سے سچے محققین کا حال مجہول (غیر معلوم) ہونے کی وجہ سے فساد واقع ہوتا ہے۔

دیکھئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں محققین باصواب کے ساتھ ساتھ جھوٹے مدعی بھی بکثرت رہے ہیں، اور طالب اگر ان کے پہچاننے میں کوتاہی کرتا ہے تو وہ غلطی میں پڑ جاتا ہے، جس کا نتیجہ فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس لئے طالب کے لئے ضروری ہے کہ شیخ کو چننے میں بہت زیادہ اہتمام سے چھان بین کرے تاکہ دھوکہ نہ ہو۔

علماء نے فن کی کتابوں میں پیر کی تلاش کا طریقہ بھی بیان کر دیا ہے، چنانچہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جن کو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی قدس سرہ

بیہقیِ وقت کہا کرتے تھے، وہ اپنی مشہور کتاب ''ارشادالطالبین'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:
جب کمالات باطنی کا طلب کرنا واجبات سے ہے تو پھر ایسے پیر کا تلاش کرنا بھی ضروری ہے جو کامل بھی ہو اور کامل بنا دینے والا بھی ہو، کیونکہ ایسے پیر کے سلسلے کے بغیر خدا تک رسائی بہت مشکل اور نادرالمثال (جس کی مثال نہیں ملتی، بالکل نہ کے برابر) ہے، مولانا رومؒ فرماتے ہیں''

نفس را نکشد بغیر از ظل پیر
دامنِ آں نفس کش محکم بگیر

'' نفس کو تو شیخ ہی مار سکتا ہے لہذا اس نفس مارنے والے کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لے''

پیرِ کامل کی تلاش

پیر کامل کی تلاش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اکثر درویشوں سے ملاقات کرتا رہے اور کسی کا انکار اور عیب جوئی نہ کرے، لیکن خود بہت سے تجسس اور تأمل (چھان بین اور خوب دیکھ بھال) کے بغیر بیعت نہ ہو۔[1]

دیکھئے اس میں تصریح ہے کہ بزرگوں کے پاس جب جائیں تو ان کا انکار اور عیب جوئی نہ کریں، اور آج حال یہ ہے کہ لوگ اس پہلی منزل میں ہی ناکام ہو جاتے ہیں یعنی یہ کہ سچے مشائخ کی خدمت میں اگر پہنچ بھی جاتے ہیں تو ان کا ادب اور احترام جیسا کہ اہلِ طریق کے نزدیک معتبر ہے نہیں کرتے، اس لئے محروم رہتے ہیں، حضرت حافظ شیرازیؒ تو ایسے شخص کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ مشائخ کی صحبت کے لائق ہی نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[1] ارشادالطالبین ص ۱۶

حافظا علم وادب وزد کہ مجلسِ شاہ　　ہر کرا نیست ادب لائقِ صحبت نبود

حافظ! علم وادب سیکھو، کہ بادشاہ کی مجلس میں بیٹھنے کے لائق باادب ہی ہوتا ہے۔ [1]

حضرت ابوعلی وقاقؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص بنا ادب کے بادشاہ کا ہم نشین ہوگا تو اس کی اس جہالت کا انجام ایک نہ ایک دن اس کے قتل کی صورت میں نمودار ہوگا۔

کیونکہ ادب نہ ہونے کی وجہ سے کبھی نہ کبھی اس سے ایسی بے ادبی ضرور ہو جائے گی جو بادشاہ کے مزاج کے خلاف ہوگی، اور وہ اس کو اس کی وجہ سے قتل کرا دے گا۔

ادب بڑی چیز ہے اور ہر ایک کا ادب اس کے شایانِ شان ہوا کرتا ہے چنانچہ ایک ادب ہوتا ہے حق تعالیٰ کا، اور ان کے احکام اور امر ونواہی کا جس کے متعلق حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ

من لم یعرف ما للہ عز جل علیہ فی نفسہٖ ولم یتأدب بأمرہٖ ونھیہٖ کان من الأدب فی عزلۃ★

جس شخص نے یہ بھی نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ کے اس کے نفس پر کیا حقوق ہیں اور حق تعالیٰ کے اوامر اور نواہی (اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کرنے کا حکم دیا وہ اوامر اور جن کو کرنے سے منع فرمایا ان کو نواہی کہتے ہیں) کے آداب سے واقف نہ ہوا تو ایسا شخص تو ادب سے گویا بالکل ہی کورا ہے۔

اسی طرح ایک ادب ہوتا ہے اہل اللہ کا جس کے متعلق حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں جب مرید ادب ترک کر دے تو جہاں سے آیا ہے وہیں واپس ہو جائے گا، یعنی شیخ کے فیض سے بالکل محروم رہ کر اس کے پاس سے بے نیل ومرام لوٹے گا۔

---

[1] رسالہ قشیریہ

شیخ نوری کا ارشاد عالی

اور شیخ نوریؒ فرماتے ہیں کہ

من لم یتأدب للوقت فوقته المقت ★

یعنی جس شخص نے وقتی آداب ہی نہیں سیکھے تو سارا وقت مقت یعنی ناراضگی (اور تنگی) میں گذر رہا ہے، (یعنی اس کا پورا ہی وقت برباد ہو گیا)۔

بزرگوں کے پاس جانا تو بہت ہی آسان ہے، لیکن ان کا حسنِ ادب نہایت دشوار امر ہے، اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی توفیق عنایت کی گئی ہو۔

چنانچہ اس کے متعلق مولانا رومؒ نے مثنوی میں ایک مستقل سرخی قائم فرمائی ہے:

از خداوند ولی التوفیق درخواست توفیق در رعایت ادب در ہمہ حال و بیان کردن خامت و ضرر ہائے بے ادبی

اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق مانگنا اور بے ادبی کے نقصانات کا بیان (یہ عنوان قائم کرنے) کے بعد فرماتے ہیں:

از خدا جوئیم توفیقِ ادب
بے ادب محروم گشت از فضل رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد
بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں کیونکہ بے ادب شخص حق تعالیٰ کے فضل سے محروم رہتا ہے، بے ادب انسان صرف اپنا ہی نقصان نہیں کرتا بلکہ ساری دنیا میں اس کی بے ادبی سے آگ لگ جاتی ہے۔

مشائخ پر اعتراض کون کرتا ہے؟

یہاں اس مقام کے مناسب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم علامہ ابن حجرؒ کا وہ کلام بھی نقل کر دیں جسے انہوں نے اپنی کتاب فتاویٰ حدیثیہ میں بیان فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ پر کس قسم کے لوگ اعتراض کرتے ہیں اور ان کے اعتراضات کی وجوہ اور خود ان کا انجام کیا ہوتا ہے،

و کثیر من النفوس یراد بها عدم التوفیق إذا رأت من استاذ شده فی التربیة تنفر عنه و ترمیه بالقبائح و النقائص مما هو عنه برئٌ و لیحذر الموفق من ذالک، فإن النفس لا ترید إلا هلاک صاحبها لا یطیعها فی الأعتراض علیٰ شیخه و إن رأه علی أدنیٰ حال حیث أمکنه أن یخرج أفعاله علیٰ تأویل صحیح و مقصد مقبول شرعا، و من فتح باب التأویل للمشائخ و أغضیٰ عن أحوالهم و و کل أمرهم إلی الله تعالیٰ و إعتنی بحال نفسه و جاهدها بحسب طاقة فإنه یرجی له الوصول إلی مقاصده و الظفر بمراده فی السر و العلانیة فی أسرع زمن و من فتح باب الأعتراض علی المشائخ و النظر فی أفعالهم و البحث عنها فإنّ ذالک علامة حرمانه و سوء عاقبته و إنه لا یفلح★[1]

اور بہت وہ لوگ جن کو توفیق حاصل نہیں جب ان کو شیخ کی جانب سے تربیت کے سلسلے میں کچھ تادیب (سختی) کی جاتی ہے تو اس سے متنفر ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور شیخ پر ایسے ایسے الزامات رکھتے ہیں جن سے وہ بالکل بری ہے، جس شخص کو اللہ نے نیک توفیق دی ہے اس کو ایسے امور سے بے حد پرہیز کرنا چاہئے، کیونکہ اپنا نفس تو انسان کو ہلاک ہی

---

[1] رسائل ابن عابدین ج ۲ ص ۲۸۹

کرنا چاہتا ہے تو شیخ کی بدخواہی کے سلسلے میں تو اس کی اطاعت ہرگز ہرگز نہ کرنی چاہئے ،اور اگر شیخ کو کسی ادنیٰ حال پر دیکھے بھی تو اس کی تاویل کسی شرعاً جائز امر سے کرنی چاہئے ،جس شخص نے مشائخ کے لئے تاویل کرنے کا یہ دروازہ کھولا اور ان کے ایسے احوال سے چشم پوشی کی اور ان کے معاملے کو اللہ کے حوالے کیا اور اپنے نفس کی فکر میں لگا رہا اور حسب طاقت اس کے ساتھ مجاہدہ بھی کرتا رہا تو ایسے شخص کے لئے بہت ہی تھوڑے زمانے میں اپنے مقصد میں کامیابی اور ظاہر و باطن کی مراد پانے کی امید کی جاتی ہے،اور جس شخص نے اس کے برعکس مشائخ پر اعتراض کا دروازہ کھولا اور ان کے افعال واحوال پر مخالفانہ اور معاندانہ نظر کی اور ان کی جستجو میں پڑا تو یہ اس کی محرومی کی علامت اور عاقبت کی تباہی کی نشانی ہے،ایسا شخص کبھی بھی فلاح نہیں پا سکتا۔

اس میں صاف ہے کہ مشائخ پر اعتراض اور انکار وہی شخص کیا کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ادب کی توفیق عنایت نہیں کی جاتی،اور وجہ اس کے انکار کی یہ ہوتی ہے کہ ایسا شخص اپنے نفس کی خواہشات کو تو اچھا سمجھتا ہے اور اس پر راضی رہتا ہے، اور ان حضرات کی تعلیم وتربیت کو جو کہ عین شفقت وخُرخواہی پر مبنی ہوا کرتی ہے سخت جانتا ہے۔

مشائخ کے افعال کی تاویل

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس شخص نے مشائخ کے افعال کی تاویل کی اور اپنے نفس کے مجاہدے اور اس کی اصلاح میں لگا رہا وہ اس طریق میں بہت جلد کامیاب ہوتا ہے ،بخلاف اس شخص کے کہ جس نے ان پر اعتراض کا دروازہ کھولا اور اپنے آپ کو دیکھنے کے بجائے ان ہی حضرات کے افعال کی ادھیڑ بُن میں لگا رہا تو یہ اس کی ناکامی ،محرومی اور (العیاذ باللہ) اس کے برے انجام کی علامت ہے، چنانچہ آج دیکھا بھی یہی جاتا ہے کہ

کسی شخص پر اعتراض اور انکار وہی کرتا ہے جس کو اس کے یہاں سے کچھ ملا نہیں ہوتا، اور یہ آج کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ لوگوں کی پرانی عادت ہے، چنانچہ امام غزالیؒ نے اس پر قرآن شریف کی اس آیت سے استدلال کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ نہایت عمدہ استدلال ہے، فرماتے ہیں کہ قرآن شریف میں آیا ہے:

وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ [الأحقاف : 11]

یعنی جب ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو یہی کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے، یعنی جب کفار مکہ کو قرآن کریم سے کوئی ہدایت نہ ملی تو بجائے اس کے کہ اس کو اپنا نقص سمجھتے، کیونکہ

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم و خس

بارش تو اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے مختلف نہ تھی لیکن زمین نے اپنے اپنے مزاج کے اعتبار سے پیداوار کی چنانچہ باغ میں پھول اگے جبکہ اسی بارش کی نمی سے شورے میں جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہو گئے۔

اس کے احسان تو ہیں عام شہیدی سب پر
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اگر کسی اندھے کو دن کا اجالا دکھائی نہیں دیتا تو اس میں آفتاب کا کیا قصور ہے؟

اس کے برعکس قرآن کریم کے متعلق کہنے لگے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے، یہی حال آج لوگوں کا مشائخ کے ساتھ ہے کہ جب اپنی خامیوں کی بنا پر ان سے فیض نہیں پاتے تو یا تو

سرے سے انکار ہی کر دیتے ہیں اور یا کوئی نہ کوئی عیب ان میں لگا دیتے ہیں، جس طرح لومڑی کہ انگور کے خوشے پر بہت کچھ اچھلی کودی مگر جب وہ ہاتھ نہ آ سکا تو کہنے لگی نگوڑے انگور کھٹے ہیں۔

ایک مثال

میں تو اس قسم کے لوگوں کی ایک اور مثال بیان کرتا ہوں، وہ یہ کہ ایک عورت اپنے شوہر کی بالکل معتقد نہیں تھی حالانکہ وہ ولی کامل تھے، ایک مرتبہ وہ اڑے اور اپنے محلے کی طرف سے نکلے، چنانچہ سب نے دیکھا اور ان کی بیوی نے بھی دیکھا، صبح کو بیوی نے ان سے کہا کہ تم تو اپنے کو ناحق ولی کہتے ہو، ولی تو رات ہم نے دیکھے ہیں کہ ہوا پر اڑے جا رہے تھے۔

انہوں نے پوچھا کہ اچھا وہ بزرگ تھے؟

کہا کہ ہاں!

پھر پوچھا کہ اچھا سچ بتاؤ کہ وہ ولی تھے یا نہیں؟ اسنے کہا بالکل وہ تو ولی تھے، جب اس سے اچھی طرح اقرار کرا لیا تو کہا کہ جانتی بھی ہو وہ بزرگ کون تھے؟ وہ میں ہی تھا، یہ سن کر اس نے کہا کہ اچھا وہ تم تھے؟ جبھی تو ٹیڑھے ٹیڑھے اڑ رہے تھے۔

دیکھا آپ نے؟ جو کسی کا معتقد نہیں ہوتا اس کے لئے انکار کے بہت سے طریقے ہیں۔ کچھ نہ بن پڑا تو یہی عیب لگا دیا کہ ٹیڑھے ٹیڑھے اڑ رہے تھے۔

مشائخ اور ان کے پیروکار

جاننا چاہئے کہ جس طرح یہ طریق قدیم ہے، اور مشائخ و محققین ہمیشہ اور ہر زمانے میں موجود رہے ہیں اسی طرح سے ہر زمانے میں ان حضرات سے دو جماعتوں کا تعلق رہا ہے

،ان کے ماننے والے بھی ہوئے ہیں اور مخالف بھی ہوئے ہیں لوگوں نے ان کی تصدیق بھی کی ہے اور کسی کسی نے انکار بھی کیا ہے۔

غرض ان کے ساتھ یہ تصدیق وتکذیب کا سلسلہ برابر رہا ہے، اور جب کہ دونوں قسم کے لوگ موجود رہے تو ان مشائخ نے ان دونوں جماعتوں کے ساتھ مختلف برتاؤ بھی کیا ہے، یعنی مخلص اور مصدق کو تو قریب کیا ہے اور منکر ومنافق کو اپنے یہاں سے نکالا اور دور کیا ہے ، بلکہ اگر ان کو ذرا سا شبہ اس امر کا ہوا ہے کہ یہ شخص ان کو حقیر سمجھ رہا ہے تو اس سے بات تک کرنا گوارا نہیں کیا گیا ہے، اس بارے میں مشائخ کے بے شمار واقعات معتبر کتابوں میں موجود ہیں ،لیکن ہم یہاں چند واقعات تصوف کی معتبر کتاب رسالۂ قشیریہ سے جو امام ابوالقاسم عبدالکریم القشیری الشافعی نیشاپوری کی مشہور ومعروف تصنیف ہے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، تاکہ جو لوگ اپنی بداخلاقی کے باوجود مشائخ سے اخلاق کا مطالبہ کرتے ہیں اور ان کے ٹوکا ٹا کی اور نگرانی واخراج (اپنے پاس سے بھگا دینے) کو جو کہ حقیقتاً اخراج نہیں ہوتا بلکہ شرائط داخلہ (اپنی اصلاح کرنے کے سلسلے میں داخل ہونے کی شرط کو حاصل کرنے کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے) بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں ،ان لوگوں کو مشائخ مصلحین کا طریقہ معلوم ہو جائے ،اور وہ یہ بھی جان لیں کہ یہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے بلکہ ہمیشہ اور ہر زمانے میں بزرگوں کا اس پر عمل رہا ہے اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ افسوس !اس زمانے میں پہلے جیسے بزرگ نہیں رہے، ورنہ ان منکرین کی خوب قلعی کھلتی، اور جو لوگ اس زمانے میں کچھ کام کرنا بھی چاہتے ہیں تو وہ بے چارے انہیں منکرین کے ڈر سے کچھ کہتے نہیں کہ یہ لوگ الٹا انہیں حضرات کو بداخلاق کہہ کے بدنام کریں گے۔

فرقت کی ابتدا

صاحب رسالہ قشیریہ باب حفظ قلوب المشائخ وترک الخلاف علیہم میں شیخ کی مخالفت اور انکار کے بارے میں لکھتے ہیں:

سمعت أستاذی أبا علی الدقاق رحمۃ اللہ علیہ یقول بدأ کل فرقة المخالفة یعنی به إن من خالف شیخه لم یبق علیٰ طریقته و انقطعت العلقة بینهما و إن جمعتهما البقعة فمن صحب شیخاً من الشیوخ ثم اعترض علیه بقلبه فقد نقض عهد الصحبة و وجبت علیه توبة علی إن الشیوخ قالوا حقوق الأستاذین لا توبة عنها★[1]

میں نے اپنے استاذ حضرت ابوعلی وقاقؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر فُرقت (جدائی ،توڑ) کی ابتدا مخالفت سے ہوا کرتی ہے، یعنی جس شخص نے اپنے شیخ کی مخالفت کی تو وہ اس کے طریقے پر باقی نہیں رہا، اور ان دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ ٹوٹ گیا، اگرچہ وہ دونوں اس کے بعد ایک ہی جگہ پر رہیں، اس لئے کہ جو شخص بھی کسی شیخ کی خدمت میں رہا پھر اس پر اپنے دل سے اعتراض بھی کر دیا تو اس نے عہدِ صحبت توڑ دیا، اور اس پر توبہ کرنا واجب اور ضروری ہے، اگرچہ مشائخ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ شیخ کے حق تلفی کی تو توبہ ہی نہیں ہے۔

ایک واقعہ

پھر آگے امام نے انکار و اعتراض کے بہت سے واقعات ذکر کئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں نے استاذ محترم ابوعلی سے سنا، فرماتے تھے کہ سہل بن عبداللہ نے ایک شخص کی

---

[1] قشیریہ ۱۶۵ قشیریہ ۱۶۵

بزرگی کی تعریف کی جو کہ بصرہ میں روٹی پکانے کا کام کرتے تھے اس تعریف کو سہل بن عبداللہ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے سنا اور سن کر ان کی زیارت کا مشتاق ہوا ، چنانچہ ملاقات کے لئے چلا یہاں تک کہ بصرہ پہنچ کر اس طباخ کی دوکان پر پہنچا اور ان بزرگ کو دیکھا کہ وہ تنور میں روٹی پکا رہے ہیں اور جیسا کہ نان بائیوں کی عادت ہوتی ہے ، اپنی داڑھی پر ایک کپڑا باندھے ہوئے ہیں یہ دیکھ کر اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ ولی ہوتا تو اس کے بال بنا نقاب کے بھی نہ جلتے ، اس طرح دل میں انکار کر کے پھر ان کو سلام کیا اور ان سے کچھ دریافت کیا ، انھوں نے فرمایا کہ اے شخص تو نے مجھ کو حقیر جانا ہے ، پس تجھ کو میرے کلام سے کچھ نفع نہ ہوگا ، یہ کہا اور اس کے علاوہ اس سے کوئی بات کرنا پسند نہ کیا۔

دیکھا آپ نے ؟ یہ حضرات منکر کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ فرماتے تھے ، نیز اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منکر شخص بزرگوں کے فیض اور ان کے نفع سے محروم رہتا ہے۔

دوسرا واقعہ

میں نے شیخ ابوعبدالرحمن سلمیؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ابوعبدالرحمن رازی نے ابوعثمان کو دیکھا کہ وہ محمد بن فضل بلخی کی بہت تعریف بیان کر رہے ہیں یہ سن کر عبدالرحمن رازی کو محمد بن فضل سے ملاقات کا اشتیاق ہوا ، چنانچہ ان کی زیارت کے لئے گئے لیکن ان کے متعلق جیسا اعتقاد ان کی تعریف سن کر لے گئے تھے ، ان کو دیکھ کر دل میں اس درجہ وقعت نہ ہوئی ، جب ابوعثمان حیری کے پاس واپس آئے تو انہوں نے پوچھا کہ ان کو کیسا پایا ، ان سے بھی کہہ دیا کہ جیسا سمجھ کر گئے تھے ویسا نہیں پایا یہ سن کر ابوعثمان نے کہا کہ بات اصل میں یہ ہوگی کہ تم نے ان کو حقیر سمجھا ہوگا اور طریق کا یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کو حقیر سمجھتا ہے وہ

اس کے فیض سے محروم کر دیا جاتا ہے، لہذا تم پھر ان کی خدمت میں جاؤ اور عظمت واحترام کے ساتھ جاؤ، پھر دیکھو کہ نفع ہوتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ وہ دوبارہ پھر گئے اور احترام کے ساتھ گئے اور ان کی زیارت سے بہت نفع ہوا۔

دیکھئے اس واقعے سے بھی معلوم ہوا کہ کسی بزرگ سے فیض حاصل کرنے کے لئے دل میں ان کا ادب واحترام ہونا بھی ضروری ہے بغیر اس کے محرومی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

اسی سلسلے میں ایک بات یہ سمجھئے کہ علماء یہ جو فرماتے ہیں کہ اس طریق میں انکار کی گنجائش نہیں تو یہ بالکل صحیح ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ انکار کی نحوست ہی بہت بری ہوتی ہے ،جس طرح اس کا ایک اثر منکر پر ہوتا ہے کہ وہ قطعی محروم رہتا ہے اسی طرح بعض مرتبہ اس کی وجہ سے شیخ پر بھی فیض بند ہو جاتا ہے، جس کا اثر دوسرے مریدین پر پڑ جاتا ہے، کہ وہ سب کے سب بھی فیض سے محروم ہو جاتے ہیں، روح المعانی میں ہے:

صحبة المنكر علىٰ أولياء الله تعالىٰ تورث فتقاً يصعّب على الخياط رتقه وتورث خرقاً يعي الواعظ رقعه★

اولیاء اللہ کے منکر کی صحبت ایسی دریدگی (پھٹن) پیدا کر دیتی ہے کہ اس کا رفو کرنا درزی کو بھی دشوار ہوتا ہے، اور ایسا شگاف (چیرا) ڈالتی ہے، جس میں واعظ بھی پیوند نہیں لگا سکتا۔

منکر کا جوتا

ومن الغريب ما يحكى أن الجنيد قدس سره جلس يوماً مع خاصة أصحابه وقد أغلق باب المجلس حذراً من الأغيار وشرعوا يذكرون الله تعالىٰ فلم يتم لهم الحضور ولا فتح لهم باب التجلى اللذى يعهدونه عندالذكر فتعجبوا من ذالك فقال الجنيد هل معكم منكر حرمنا بسببه فقالوا لا ثم

اجتهدوا فی معرفة المانع فلم یجدوا ألا نعلاً لمنکر فقال الجنید من هنا أوتینا فانظریر حمک اللہ تعالیٰ أذا کان هذا نعل المنکر فما ظنک أذا حضر بلحیته★

حکایت غریبیہ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جنیدؒ اپنے خاص اصحاب کے ہمراہ تشریف فرما تھے، اور مکان کا دروازہ بند کر کھا تھا تا کہ کوئی اجنبی شخص نہ آ سکے، اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول تھے، لیکن جیسا حضور قلب اور تجلی ذکر کے وقت ہوا کرتی تھی اس دن نہ ہوئی، چنانچہ اس پر سب لوگوں کو تعجب ہوا کہ آخر کیا بات ہے؟ اتنے میں حضرت نے فرمایا کہ تم میں کوئی منکر شخص تو نہیں آ گیا ہے، جس کے سبب آج ہم محروم ہوئے ہیں، لوگوں نے عرض کیا کہ نہیں حضرت کوئی منکر تو ہم میں معلوم نہیں ہوتا، پھر سب کے سب رکاوٹ کی وجہ دریافت کرنے کی فکر میں لگ گئے، بالآخر کسی منکر کے ایک پیر کی جوتی ملی، اس کے علاوہ کچھ نہ ملا جسے کوئی مرید غلطی سے بدل لایا تھا، حضرت کو جب اس کا پتہ چلا تو فرمایا کہ بس معلوم ہوا، اسی کی نحوست ہے اور یہی ہماری محرومی کا سبب ہے۔

پس اے مخاطب، اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے، دیکھ اور سبق لے کہ جب اتنا اثر صرف منکر کی ایک جوتی کا ہوسکتا ہے تو اگر کہیں خود کوئی منکر ہی اپنی داڑھی سمیت کسی شیخ کی مجلس میں حاضر ہو جائے تو کیا ہوگا؟[۱]

دیکھا آپ نے؟ انکار کی نحوست کہ حضرت جنید جیسا ولی کامل جو اولیاء اللہ کے سردار اور جماعت کے امام گذرے ہیں، جب ان پر منکر کے ایک جوتے کے آجانے سے فیض بند ہوسکتا ہے تو دوسرے مشائخ کے یہاں مسلّم منکر پہنچ کر کیا کچھ خلل اندازی نہ کرے گا؟

---

[۱] روح المعانی ج۱۰ ص ۹۴

اسی لئے حضرات مشائخ انکار سے چڑتے اور منکر سے نفرت فرماتے ہیں، اور اسی لئے طریق کا مسلمہ اصول ہے کہ اس میں چوری، زنا اور دیگر معصیت کی تو معافی ہے مگر انکار کی معافی بالکل نہیں، کیونکہ یہ سب معاصی تو بدعملی ہیں اور بدعمل شخص اصلاح کے لئے طریق میں داخل ہوسکتا ہے، لیکن انکار تو بداعتقادی ہے لہذا اس کی معافی نہیں۔

بیعت کی حقیقت

جس طرح علماء باطن نے پیر تلاش کرنے کا طریقہ بتلایا ہے اسی طرح یہ حضرات اس کو بھی بیان فرماتے ہیں کہ شیخ کے اندر کن کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے؟ جن کی رعایت کرتے ہوئے کسی کو شیخ تجویز کرنا چاہئے، اس کے لئے ہم یہاں سید المفسرین حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب، خلف عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے رسالے ''بیعت'' کی عبارت درج کرتے ہیں، جس میں شاہ صاحب نے پہلے بیعت شریعت کی تعریف اور اس کی ضرورت بیان فرمائی ہے، اور اسکے بعد شیخ کے اوصاف کا بیان کیا ہے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''اما بیعت شریعت حقیقتش آں کہ مرد عامی کہ عمر را در غفلت و معصیت گذاردہ ہرگاہ بریں خیال تنبیہ میشود و ندامت می کشد و رجوع بر آن تقویٰ و طاعت می خواہد، حصول ایں معنی بدون تحکیم عالم متقی بر ظاہر و باطن خود در عادت منتظم نمی تواند شد چہ دیدن کتاب ہائے شریعت مانند مراجعت کتب طب است بیمار را بدون حصول ملکۂ طب و معالجہ باینقدر اصلاح مزاج و دفع مرض دشوار است۔ (رسالہ بیعت ص ۲۷)

بیعت شریعت کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عامی شخص جس نے کہ اپنی عمر کو غفلت اور معصیت کے کاموں میں صرف کی ہو، جب اس کو اپنے اس حال پر تنبہ ہو یعنی اس کی درستگی کا خیال

آئے ،اورحالات گذشتہ پر وہ نادم ہوکر تقوی اور طاعت کے کاموں کی جانب رجوع کرنا چاہے تو کسی عالم جو ظاہراً و باطناً متقی ہو،کو اپنے اوپر حاکم بنائے بغیر بطور خود نہیں ہوسکتا ،کیونکہ شریعت کی کتابں کا مطالعہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی طب کی کتاب کا ، اور یہ سب جانتے ہیں کہ بیمار کے لئے بغیر طب کے علم اور اس میں مہارت کے مزاج کی اصلاح اور اس کا درست معالجہ اور مرض کا دفع کر لینا بہت دشوار ہے۔

شیخ کا انتخاب

یہاں تک تو بیعت کی حقیقت اور اس کی ضرورت کا بیان تھا آگے شیخ کے انتخاب کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

وہم چنیں بقول ہر عالمے عمل کردن موجب تحیر است ،کہ ہر یکے صحیح الفکر والحواس نمی باشد،پس بناء بریں ضرورت مردے را کہ باوجود علم وتقوی دوصفت داشتہ باشد یکے عدم مساہلت ومداہنت در مقام امر بالمعروف ونہی عن المنکر،دوم شناختن آنچہ بحال طالب افضل و اسہل است ،پس ایں چنیں کس را اختیار کند در نام امور خود را بدست او سپارد ومتابعت او برخود لازم گیرد تا مراد خود رسد،وثمرہ ایں رسیدن است بنجات کلی در عقبیٰ ودخول اودر جناب العلی وتحصیل رضائے مولیٰ (رسالہ بیعت ص ۲۷)

اور اسی طرح ہر عالم کے قول پر عمل کر لینا حیرانی و پریشانی کا سبب ہے، کیونکہ ہر عالم بھی تو صحیح فکر ونظر کا مالک نہیں ہوتا،لہذا اس ضرورت کے ماتحت کسی کو اپنا شیخ اور مصلح ومقتدیٰ اور پیشوا بنانے کے لئے ایسے شخص کا انتخاب کرنا چاہئے کہ وہ علاوہ علم وتقویٰ کے اورادو اوصاف سے بھی متصف ہو اور وہ اوصاف ہیں ایک تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں تساہل اور تسامح کو روا نہ رکھتا ہو، دوسرے یہ کہ طالب کے مناسب حال سہل اور

افضل جوامور ہوں ان کی شناخت میں ماہر ہو، پس ایسے شخص کو اختیار کرے اور اپنے تمام امور کی لگام اس کے ہاتھ میں دیدے، یعنی اصلاح کے معاملے میں اس کو اپنے اوپر کلی اختیار دیدے، اور اس کی اتباع کو اپنے اوپر لازم کرلے، تاکہ اپنی مراد کو پہنچے اور اس پہنچنے کا ثمرہ آخرت میں نجات اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی اور مولیٰ کی رضا وخوشنودی کا حصول ہے۔

علماء کی ان مذکورہ بالا تصریحات سے معلوم ہوا کہ مشائخ سے فیض اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انکار نہ ہو، ان کی شان میں کسی قسم کی بے ادبی نہ کی گئی ہو، اور ان کے یہاں تکبر وغرور اور خود بینی وغیرہ لے کر نہ جائے ورنہ بجز ناکامی ومحرومی کے اور کچھ حاصل نہیں، اور جس طرح ان امور کا پایا جانا حصول نفع کے لئے شرط ہے، اسی طرح مشائخ محققین نے بھی تصریح فرمائی ہے کہ طریق میں داخل ہونے کے بعد بھی سالک کے لئے سلوک کے کچھ اصول ہیں ان کی رعایت کرنے پر ہی وصل اور کامیابی ممکن ہے ورنہ ان کے ضائع ہونے کی وجہ سے محرومی لازم ہے، چنانچہ صاحب رسالۂ قشیریہ نے لکھا ہے

إنما حرموا الوصول لتضييعهم الأصول★

یعنی لوگ اللہ کے وصل سے اصول ضائع کرنے کی بنا پر محروم ہو گئے ہیں۔

اس راہ کے اصول

اب رہی بات یہ بات کہ طریق کے اصول کیا ہیں؟ تو اس موضوع پر میں نے حضرت شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ عمدہ کلام کسی کا نہیں دیکھا، اس لئے ہم ان کی مشہور کتاب ''منہج العمال'' جو انہیں کی کتاب کنز العمال کی تلخیص ہے، سے طریق کے وہ اصول جو اس میں بیان کئے گئے ہیں یہاں جوں کے توں لکھتے ہیں:

اکلِ حلال

”منها أكل الحلال وهو اهم الأصول لأن الحلال يثيب ثواب عبادة لم يفعله الشخص والحرام يبطل ثواب العبادة فعلها الشخص تو ضيحه شخص تعب فی النهار بسبب الكسب الحلال وكانت له وظيفة عبادة فی الليل ففاتت منه بسبب التعب فلا شک أنه يعطیٰ ثواب تلک العبادة ومن أكل الحرام أو لبس الحرام فالغالب أنه لا يوفق الطاعة وإن وفق نادراً وقام الليل كله يصلی لا يقبل الله صلوٰته لأنه لا يخلو عن رياء أو سمعته أو عجب فيبطل ثوابها وورد من اشتریٰ ثوباً بعشرة دراهمو فيه درهم حرام لم يقبل الله صلوٰة مادام عليه منه شئٌ★(رواه أحمد عن عمر رضی اللہ عنہ)

قال ذوالنون وجوه الحلال خمسة تجارة با الصدق،وصناعة با لنصح، وصيدالبر والبحر،والميراث حلال الأصل ،وهدية من موضع ترضاهاو قال المهدی أجمع العلماء علی إن الحلال المطلق ما أخذ من يد الله تعالیٰ بسقوط الوسائط★

طریق کے بہت سے اصول ہیں،ان میں سے ایک اکل حلال ہے اور یہ اہم ترین اصول ہے،اس لئے کہ حلال روزی انسان کو اس عبادت کا ثواب بھی دلا دیتی ہے جو اس نے کی بھی نہیں،اور اس کے برعکس حرام کا حال یہ ہے کہ یہ انسان کے کئے ہوئے نیک اعمال کا ثواب بھی باطل کر دیتا ہے،تشریح کے طور پر مثلاً ایک شخص حلال روزی کمانے کی وجہ سے تھک گیا اور رات میں جس عبادت کو کرنے کا معمول تھا اس کو تھکن کے باعث کر نہ سکا،تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو اس کا ثواب مل جائے گا،اس کے برخلاف جو شخص حرام

کھائے یا حرام پہنے تو اول تو ایسے شخص کو طاعت کی توفیق ہی نہیں ہوتی، اور اگر شاذ و نادر (کبھی کبھار، نہ کے برابر) توفیق ہوئی بھی اور ساری رات نماز میں کھڑا بھی رہا تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز کو قبول نہیں فرمائیں گے، اس لئے کہ وہ ریا، نام ونمود اور عجب سے خالی نہ ہوگی، پس اس کی وجہ سے اس کا ثواب برباد ہوجائے گا، حدیث پاک میں وارد ہے کہ کسی شخص نے دس درہم کا کپڑا خریدا اور ان میں ایک درہم حرام کمائی کا شامل تھا تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز کو اس وقت تک قبول نہیں فرمائیں گے جب تک اس کے بدن پر اس کپڑے کا ایک بھی تار موجود ہوگا، (اس کو امام احمدؒ نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا)

حضرت ذوالنونؒ نے فرمایا ہے کہ حلال آمدنی کے حاصل کرنے کے پانچ طریقے ہیں (۱) سچائی کے ساتھ تجارت کرنا (۲) خیر خواہی کے ساتھ کوئی پیشہ یا صنعت اختیار کرنا (۳) خشکی یا سمندر میں شکار کرنا (۴) حلال میراث کا حاصل ہونا (۵) ایسے آدمی سے ہدیہ لینا جس کو پسند کرتا ہو مہدی کہتے ہیں اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ حلال مطلق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ

کے دست مبارک سے براہِ راست بنا کسی واسطے کے حاصل ہو۔

حسنِ اخلاق

ومنها حسن الخلق اعلم أن حسن الخلق هو معاملتک مع كل أحد بما يسره إلا فيما يخالف الشرع، ثم اعلم إن الأخلاق الحميدة كثيرة وأصلها التواضع والبواقي تدور عليه، والأخلاق الذميمة كثيرة وأصلها التكبر والبواقي تدور عليه★

طریق کے اصولوں میں ایک اچھا اخلاق بھی ہے، اور اچھا اخلاق یہ ہے کہ تیرا معاملہ ہر

ایک انسان کے ساتھ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ خوش ہوجائے البتہ وہ بات خلاف شریعت ہوتو مولیٰ کی مرضی پر چلنا چاہئے، پھر کوئی ناراض ہوتو کوئی پرواہ نہیں، یہ بھی خیال رہے کہ اچھے اخلاق کی فہرست تو لمبی ہے، لیکن ان سب کی بنیاد تواضع ہے باقی سب اسی سے پیدا ہو تے ہیں اور اسی پر سب کا مدار ہے، اسی طرح برے اخلاق بھی بہت سے ہیں لیکن ان سب کی جڑ تکبر ہے اور باقی سب اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔

صحبت ودوستی

ومنها مجانبة الأضداد وهو كل من ليس مقصده مقصدك★

اور ان اصولوں میں سے ناجنس کی صحبت سے بچنا بھی ہے اور ناجنس ہر وہ شخص ہے جس کا مقصد اور کام تمہارے مقصد سے الگ ہو، آج کل سب سے زیادہ نقصان لوگوں کو اسی سے پہنچ رہا ہے۔ (یعنی جو لوگ سلوک واصلاح باطن سے غافل یا اس سے نامتفق ہیں ان کی صحبت سے دور رہے، کیونکہ ان لوگوں کی صحبت سالک کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے اور اصلاح باطن جیسے عظیم الشان کام کا استخفاف دل میں پیدا ہوتا ہے، جو سالک کے لئے زہر ہے)

ڈھیل

ومنها عدم الإغترار بإحسان الله تعالیٰ مع الإصرار على الذنوب

كما ورد في الحديث ذا رأيت الله يعطى العبد من الدنيا ما يحب وهو يقيم على معاصيه فإنما ذالك استدراج منه★[1]

وقال بن عطاء خف من وجود إحسانه إليك ودوام أسائتك معه أن يكون

---

۱ (أ[illegible] عقبة رضي الله عنه)

ذالک إستدراجاً، :سنستدرجهم من حیث لا یعلمون (القلم)وقال أیضاً من جهل المرید أن یسیئ الأدب فتؤخر العقوبة عنه فیقول لو کان هذا سوء أدب لقطع الإمداد وأوجب البعاد فقد قطع المدد من حیث لا یشعر لو لم یکن هذا لا یمنع المرید وقد یقام مقام البعد ولو لم یکن الا أن یخلیک وما ترید★

اورایک اصول یہ بھی ہے گناہوں پر قائم رہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش سے دھوکہ نہ کھائے، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب تم دیکھو کہ کوئی بندہ گناہوں پر اٹل ہے اور پھر بھی اللہ تعالیٰ اس کو دنیاوی عیش کی چیزیں دے رہا ہے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی ڈھیل اور آزمائش ہے (اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔)

ابن عطا نے فرمایا ہے کہ اس بات سے ڈر کہ اللہ تعالیٰ کے تجھ پر احسانات برابر ہوتے رہیں اور تو برابر گناہ میں ملوث رہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ یہ استدراج ہو (جیسا کہ ارشاد ہے):''ہم ان کو بتدریج لئے جارہے ہیں اور ان کو اس کی خبر تک نہیں:'' اور ابن عطا کا ہی یہ بھی کہنا ہے کہ یہ مرید کی جہالت ہے کہ اگر اس کی بے ادبی پر کوئی فوری سزا نہ ملے تو یہ کہنے لگ جائے کہ یہ بے ادبی نہیں ہے، اگر یہ بے ادبی ہوتی تو امداد رک جاتی، (تو اسے سمجھ لینا چاہئے امداد تو رک چکی ہے، اور ایسے انداز سے رکی ہے کہ اس کو اس کا شعور بھی نہ ہو سکا، اگر ایسا نہ ہوتا یہ شخص ترقی سے نہ روکا جاتا، اور ترقی کا جاری نہ رہنا بھی دوری ہی ہے، اگرچہ یہ صرف اتنی ہو کہ تم کو تمہارے نفس کے حوالے چھوڑ دیا جائے کہ تم جانو اور تمہارا کام جانے۔

مردارِ دنیا

ومنها ازهد فی الدنیا إعلم أنه امانع الاکبر الدی منع السالکین عن السلوک حب الدنیا، والأیات والأخبار فی بغض الدنیا کثیرۃ نقتصر منها علیٰ أیۃ وحدیث قال اللہ تعالیٰ: ”من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید ثم جعلنا لہ جھنم یصلٰھا مذ موماً مد حوراً (إسرا) وممد فی الحدیث ”حب الدنیا رأس کل خطیئۃ★[1]

ومعرفۃ الدنیا أمر مھم فربما یکون الشخص فقیراً لیس عندہ قوت یوم ولا ثوب غیر ما یستر عورتہ وھو یظن أنہ فقیر وھو من أھل الدنیا بعلامات وربما یکون الشخص ذا مال وأمتعۃ وھو یظن أنہ من أھل الدنیا والحال أنہ لیس من أھل الدنیا بعلامات ذکرناھا فیھا وبعض تفاصیل الزھد ومسائلہ مذکورۃ فی کتاب منھاج العابدین و فی مختصرات الأحیاء وفی الجملۃ الدنیا مبغوضۃ اللہ، واللہ تعالیٰ محبوب السالک والمنافاۃ بین الضدین ظاھر فافھم★[2]

اور ایک ان اصولوں میں سے دنیا سے بے رغبتی ہے، یاد رکھو! حب دنیا وہ مانع اکبر (سب سے بڑی رکاوٹ) ہے جس نے بہت سے سالکین کو سلوک سے روک دیا ہے اور اللہ کے نزدیک دنیا کے مبغوض (ناپسندیدہ) ہونے کے سلسلے میں آیات وروایات بہت ہیں، ہم یہاں ایک آیت اور ایک حدیث لکھتے ہیں، حق تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1](جامع الأصول [illegible] مرفوعاً)

[2](منہج اعمال)

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا [الإسراء : 18]

''جو دنیا کی طرف لپکے گا ہم اس کو دنیاوی مال ومتاع جتنا ہم جس کے لئے چاہیں گے دے دیں گے (یہ نہیں کہ اس کی خواہش کے مطابق مل جائے گا بلکہ ملے گا اب بھی اتنا ہی جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں گے اور یہ بھی نہیں کہ سب کو ملے گا بلکہ جس کو چاہیں گے مل جائے گا اور جس کو نہ چاہیں گے نہ ملے گا البتہ نیت کی وجہ دنیاوی کتوں میں شامل ہوجائے گا،)اور پھر اس کے لئے جہنم تجویز کردیں گے، اس میں ذلیل وخوار ہوکر جائیگا۔

اور حدیث شریف میں وارد ہے: ''دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

اور دنیا داری کی پہچان ایک اہم معاملہ ہے کیونکہ بسا اوقات کوئی بالکل کنگال ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کے پاس سوا ایک دن کے کھانے اور ستر ڈھانکنے لائق کپڑے کے کچھ بھی نہیں ہوتا، اور وہ خود بھی اپنے آپ کو فقیر ہی سمجھتا ہے لیکن وہ دنیا دار ہوتا ہے، اس واسطے کہ وہ دل میں مال کی محبت رکھتا ہے، جس کی کچھ علامات ہیں۔

اسی طرح ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص مالدار اور ساز وسامان والا ہوتا ہے، اور اپنے آپ کو وہ اہل دنیا میں سے سمجھتا ہے، مگر وہ دنیا دار نہیں ہوتا، اس واسطے کہ وہ دنیا کی محبت اپنے دل میں نہیں رکھتا، اس کی بھی کچھ علامات ہیں جن کو ہم نے اپنے اسی رسالے میں ذکر کیا ہے ، اور زہد کی کچھ تفصیل اور اس کے مسائل کتاب ''منہاج العابدین اور مختصر الاحیا'' وغیرہ میں ذکر کی گئی ہیں ، کلام کا حاصل یہ ہے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض (ناپسندیدہ) ہے، اور اللہ تعالیٰ سالک کا محبوب ہے، پس دنیا گویا اس کے محبوب کی مبغوض ہے اور ظاہر ہے کہ محبوب کی ناپسندیدہ چیز خود کو بھی ناپسند ہوا کرتی ہے، ایسا تو ممکن نہیں ہو

سکتا کہ محبوب بھی دل میں رہے اور اس کی ناپسندیدہ چیز بھی دل میں رہے، کیونکہ یہ تو ضدین (دو مخالفوں مثلاً آگ اور پانی) کو ایک جگہ جمع کرنا ہوا جو محال ہے ،ضدین کے درمیان جو منافات (دوری اور مخالفت) ہوا کرتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے، خوب سمجھ لیجئے!

نفع کیوں نہیں ہوتا؟

طریق کے یہ سب اصول آپ کے سامنے ہیں اب اس کا فیصلہ آپ خود ہی کرلیں کہ لوگوں کو مشائخ کے یہاں سے اگر نفع نہیں ہوتا تو اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا اس کی وجہ ہے کہ لوگ تو طریق کا حق اور مشائخ کے آداب کی پوری پوری رعایت کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کو فائدہ نہیں ہوتا؟ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ طریق میں داخل ہوتے بھی ہیں وہ حقیقی اعتبار سے طریق میں داخل نہیں ہوتے؟ پھر جب لوگ خود کچھ کام نہ کریں اور طریق کا ان کے نزدیک نہ کوئی طریقہ ہو اور نہ کوئی اصول تو ناکامی کا رونا کیسا؟ اور اس کے ذمہ دار مشائخ کیوں ٹھہرائے جائیں؟

جب کہ یہ امر مسلم ہے کہ دین یا دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا کام بے اصولی سے انجام نہیں پاسکتا، بلکہ ہر کام کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں جنکی رعایت ضروری ہوتی ہے، پھر اس قاعدہ سے طریق کو ہی کیوں الگ کردیا گیا؟ کہ اسکے لئے نہ کچھ اصول ہوں اور نہ آداب، اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ آج لوگوں کے نزدیک تصوف کی بس یہ حیثیت ہے کہ:

ع یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا

پہلا قدم سچی طلب

پھر ان پانچ اصولوں کو تو چھوڑئے جن کا ذکر ہوا (حلال رزق، حسن اخلاق، ناجنس کی صحبت سے پرہیز، گناہ کے باوجود اللہ کے انعامات سے خوف اور دنیا سے بے رغبتی) کہ ان کا

نمبر تو طریق میں داخل ہونے کے بعد آتا ہے، ان سب سے پہلا قدم جو سالک کے لئے اصل ہے وہ سچی طلب ہے پہلے اسی کا جائزہ لیجئے، تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ آج کل کے سالکین میں یہ پہلی شرط ہی غائب ہے، حالانکہ اس کے متعلق رسالۂ قشیریہ میں لکھا ہے:

فأول قدم للمريد في هذه الطريقة ينبغي أن يكون على الصدق ليصلح له البناء علىٰ اصل صحيح فأن الشيوخ قالوا أنما حرمو الوصول لتضييعهم الأصول★[1]

اس طریق میں مرید کا پہلا قدم سچی طلب ہونا چاہئے تا کہ اس کو بنیاد کے لئے ایک ٹھوس زمین مل سکے، کیونکہ مشائخ نے کہا ہے کہ لوگ اللہ کے وصل سے اس لئے محروم ہیں کہ انہوں نے اصول کو ضائع کر دیا ہے۔

بہت سے طالبین جو مشائخ کی تلاش میں نکلتے ہیں اور جگہ جگہ جا کر مشائخ سے ملتے ہیں اور ان کو فیل کر کے چلے آتے ہیں، خود وہ اس پہلی ہی شرط میں فیل ہیں اور اگر بعضوں میں کچھ طلب بھی ہوتی ہے تو ناقص ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کو نفع کی بجائے کچھ نقصان ہی ہوتا ہے۔

خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رسد دیوار کج

اگر معمار نے پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھدی ہے تو چاہے ثریا تک جائے دیوار تو ٹیڑھی ہی رہے گی۔

اسی طرح جب طریق کی پہلی ہی اینٹ ٹیڑھی ہوگی تو اس پر قائم ہونے والی دیوار کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔

---

[1] (قشیریہ ص ۱۹۷)

گو یہ صحیح ہے کہ صدق (سچائی) دونوں کی ہی صفت ہے، شیخ کی بھی اور مرید کی بھی، یعنی شیخ کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں صادق ہونا چاہئے اور مرید کو بھی اپنی ارادت اور طلب میں صادق ہونا چاہئے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ مریدین مشائخ سے تو صدق کا مطالبہ کرتے ہیں اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ شیخ میں صدق ضروری ہے مرید چاہے کیسا ہو، جھوٹا ہو، غیر طالب ہو یا غیر مخلص ہو مگر ہر حال میں اس کو طریق میں داخل کرنا ہی چاہئے، یہ آخر کیوں؟ حالانکہ کسی چیز کا دوسروں سے مطالبہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ انسان اسے پہلے اپنے اندر پیدا کرلے، کیونکہ دوسرے کے فعل پر تو اختیار نہیں لیکن اپنے اوپر تو اختیار رہوتا ہے، پھر یہ لوگ اس قاعدے سے کیوں الگ ہونا چاہتے ہیں؟ جبکہ مشائخ نے سچی ارادت کو ہی کامیابی کی کنجی قرار دیا ہے۔

درارادت باش صادق اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید

اے فرید ارادت وعقیدت میں سچے بنو تا کہ عرفان کے خزانے کی کنجی پاسکو۔

آج کل لوگ اس کنجی کے بنا ہی عرفان کے خزانے کا تالا کھول ڈالنا چاہتے ہیں بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ حاصل یہ ہے کہ سالکین کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اپنے اندر صدق وخلوص پیدا کریں، اس کے بعد مشائخ میں اس کو تلاش کریں (یعنی اس کے بعد بیعت ہونے سے پہلے ان اوصاف کے حامل شیخ کی تلاش کرے۔

اور اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جس شیخ سے بیعت ہوگیا ہے اب اس کے اندر ان اوصاف کی جانچ پرکھ کرنے لگ جائے،) اور جب طریقہ سے کوئی کام کیا جائے گا تو انشاء اللہ نتیجہ بھی درست نکلے گا، لہذا سچی طلب اور خلوص کے ساتھ شیخ کی تلاش وجستجو کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ اپنے کسی نہ کسی بندے سے ملاقات بھی کرا ہی دیں گے جس سے اس کا کام بن

جائے گا ورنہ اگر بنا صدق وخلوص اختیار کئے مشائخ کو تلاش کروگے تو اگر ساری عمر بھی تلاش کرتے رہوگے تو تب بھی کسی سچے سے تو ملاقات نہیں ہوگی البتہ تمہاری طلب جیسا ہی کوئی ''کامل'' مل جائے تو مل جائے، بلکہ زیادہ اندیشہ تو اس بات کا ہے کہ ایسا کرتے کرتے (یعنی ایک کے پاس گئے اس کا انکار کیا، دوسرے کے پاس گئے اسکا انکار کیا اسی طرح کرتے کرتے) یہ انکار ہی تمہارا حال بن جائے اور اس کے بعد کوئی ملے ہی نہیں۔

ناواقفی کا اثر

یہ عدم صدق (سچائی کا نہ ہونا) اور انکار جس کے متعلق مفصل کلام ہو چکا اس زمانے میں ایک عام قلبی مرض (دل کی بیماری) ہو گیا ہے، جو بزرگوں کے پاس آنے جانے والوں میں بکثرت پایا جاتا ہے، لہذا جو لوگ کسی بزرگ سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو تو اس اصول کا اہتمام اور لحاظ بہت ہی ضروری ہے، آج کل اس سلسلے میں لوگوں سے بہت ہی زیادہ کوتاہی ہو رہی ہے، جسکی وجہ زیادہ تر طریق واہل طریق کے آداب سے ناواقف ہونا ہے، اور اسی ناواقفی کا اثر ہے کہ بعض لوگ برسوں تک بزرگوں کے یہاں آتے جاتے ہیں لیکن جہاں تھے وہیں کے وہیں رہتے ہیں، بلکہ بعض لوگ تو الٹا اور بگڑ جاتے ہیں، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ لوگ دراصل طلب میں ہی صادق نہیں ہوتے، اور ارادت میں ہی غیر مخلص ہوتے ہیں، جسکا اظہار کبھی کبھی مدتوں بعد ہوتا ہے۔

تواں شناخت بیک روز در شمائل مرد
کہ تا کجاست رسیدہ است پایگاہ علم
ولے زباطنش ایمن مباش وغرہ مشو
کہ خبث نفس نہ گردد بالہا معلوم

انسان کے علم کا اندازہ اس کے حالات سے ایک دن میں لگایا جا سکتا
ہے کہ اس کا علمی پایہ کتنا بلند ہے، لیکن اس کے باطن سے بے خوف نہ
ہونا چاہیئے کہ نفس کی خباثت سالہا سال معلوم نہیں ہو پاتی۔ (رومیؔ)

لوگ اپنے اندر صدق وارادت نہ ہونے جیسا زبردست روگ لئے ہوتے ہیں اور پھر اس پر مشائخ سے نفع نہ ہونے کی شکایت کرتے ہیں، ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے'' الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے''

اسی سلسلے میں آپ سے ایک بات اور بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے لئے تو ایک گل جھڑی بن کر رہ گئی ہے، باقی آپ حضرات اس کا کوئی حل نکال سکتے ہوں تو نکال لیجئے، اور وہ یہ کہ لوگوں کا مشائخ کے پاس آنا جانا دیکھ کر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان کے معتقد ہیں، اور ان کو کامل اور اپنے اپ کو ناقص سمجھتے ہیں اور ان کے پاس اپنا نقص دور کرنے کی غرض سے آتے ہیں، لیکن مشائخ کے یہاں پہنچ کر ان کے معمولات میں دخل دینے لگتے ہیں اور اپنی رائے لگانے سے باز نہیں رہتے، حالانکہ ان کو یہ سمجھنا چاہیئے تھا کہ جب ہم خود ناقص ہیں تو کسی ناقص کی رائے کب معتبر ہے قاعدہ ہے: رأی العلیل علیل ''یعنی بیمار کی رائے بھی بیمار ہوتی ہے، لہذا ان کی رائے بھی ناقص پس ان کا اعتبار ہی کیا؟

لیکن ان کا نقص ہی ان کو یہ سمجھنے نہیں دیتا، اسی کی وجہ سے رائے دیتے ہیں اور ان پر طرح طرح کے اعتراضات اور نکتہ چینی کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ان حضرات کے اعتقاد کا لحاظ تو کیا پاسِ ادب بھی ملحوظ نہیں ہے، اور یہ لوگ اپنے کو کامل سمجھتے ہیں اور ان مشائخ کو ناقص، اور ایک ناقص کی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو کامل جانے، اور کامل کو ناقص بتلائے، کیونکہ کمال کی بات تو خود کو ناقص اور کامل کو کامل سمجھنا ہے۔

ہر کہ نقصِ خویش را دید و شناخت　　سوئے استکمالِ خود دو اسپہ تاخت

جس شخص نے اپنے عیب کو دیکھا اور پہچان لیا تو اپنے کو کامل بنانے کے لئے وہ تیز قدم چل پڑا۔

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کے ان مختلف افعال میں کیسے جوڑ بٹھایا جائے؟ نہ تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کو معتقد سمجھا جائے، اگر ایسا ہوتا تو اعتراض کیوں کرتے؟ کیونکہ جسکی عظمت اور احترام دل میں ہو اس کے افعال پر نکیر (اعتراض) کرنے کے کیا معنیٰ؟

اور اگر غیر معتقد مانا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان حضرات کے پاس یہ لوگ آتے کیوں ہیں؟ اور زبان و ظاہر سے اعتقاد کیوں ظاہر کرتے ہیں؟

اور اگر یہ لوگ خود کامل ہیں تو ان کو مشائخ کی حاجت ہی کیا ہے؟

بہر حال کوئی معقول بات سمجھ میں نہیں آتی، اس قماش کے لوگ یہاں بھی آجاتے ہیں اور بجائے کچھ حاصل کرنے کے اپنا ہی کچھ فیض مجھے پہنچا جاتے ہیں (یعنی ایسی باتیں کر جاتے ہیں جن سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔)

بداعتقادی کیوں ہے؟

باقی رہا یہ سوال کہ اس زمانے میں مشائخ سے یہ بداعتقادی کیوں ہے؟ اور لوگ ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ انکے معمولات پر نکتہ چینی اور ان کے حالات پر اعتراض کیوں کرتے ہیں؟ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ لوگ مشائخ کے احوال کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں، چنانچہ ان کو مشائخ سے اسی قسم کی شکایت ہوتی ہے کہ ان کا فلاں کام خلاف سنت ہے، اور فلاں بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے خلاف ہے، حالانکہ ان مسکینوں کو نہ سنت کی ہوا لگی ہے اور نہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

اخلاق سے ہی آشنا ہیں، پھر بھلا مشائخ میں ان اخلاق کو کیونکر پہچان سکتے ہیں؟

تو نہ دیدی گہے سلیماں را　　پہ شناسی زبان مرغاں را

جب تو نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو کبھی دیکھا ہی نہیں تو تو پرندوں کی بولی کو بھلا کیا سمجھے گا؟

لیکن اپنے افعال واحوال پر ان کی نظر نہیں، نہ اس کا خیال کہ ہم کیسے ہیں؟ اور نہ اس کی فکر کہ ہم کو کیسا ہونا چاہئے؟ اپنے حالات تو چاہے منافقین جیسے بنا رکھے ہوں لیکن مشائخ سے مطالبہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ جیسے ہوں بلکہ یہ کہ اخلاق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ہوں۔

مورشیوہ

میں کہتا ہوں کہ خیر یہ تو صحیح ہے کہ مشائخ کو کامل نمونہ اور اعلیٰ درجہ کا متبع سنت (سنت پر چلنے والا) ہونا چاہئے، مگر آپ کو کیسا ہونا چاہئے؟ کچھ اس کی خبر بھی ہے؟ حضرات صحابہ کرامؓ کی بات جانے دیجئے، لیکن کیا آج کل کے مرید پہلے زمانے کے مریدوں جیسے بھی ہیں؟ اگر نہیں ہیں.....اور یقیناً نہیں ہیں تو پھر غور کیجئے کہ یہ مطالبہ کہاں تک انصاف کے مطابق ہے؟

مشائخ کا معاملہ تو ان پر چھوڑ یئے کہ وہ جیسے کچھ بھی ہونگے اپنے فعل کے خود ذمہ دار اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہ ہونگے، لیکن آپ تو پہلے اپنے حالات کو خیر القرون کے حالات کے مطابق کر لیجئے!

دل میں تو عظمت کا نہ ہونا، اور زبان و جوارح (ہاتھ پیر) سے خوش کن (ظاہر میں اچھے لگنے والے) اقوال وافعال کرنا کب دین میں داخل رہا ہے؟

قرآن وحدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب مورشیوہ (شیخی باز، مور پنکھے، دکھنے میں اچھے چکھنے میں کھٹے) منافقین تھے۔

عن قتادة رضی اللہ عنہ قال بینما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فی غزوته إلیٰ تبوک و بین یدیه أناس من المنافقین فقالو اأیر جو اهذاالر جل أن یفتح له قصور الشام و حصو نها هیهات هیهات فاطلع اللہ نبیه صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیٰ ذالک فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احسبو اعلیّ هٰؤ لاء الر کب فأتٰهم فقال قلتم کذا قلتم کذا قالو یا نبی اللہ إنما کنانخو ض و نلعب ★

حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیساتھ تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ تبوک میں تشریف لے جا رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے منافقین کی ایک جماعت (بھی اس غزوہ میں شرکت کے لئے جارہی) تھی، ان لوگوں نے آپس میں کہا کہ دیکھو تو بھلا یہ شخص (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی شام کے قلعوں اور محلوں کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے، (معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی اس کانا پھوسی کی خبر کردی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ اس جماعت کو ذرا روک تو لو! اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جماعت کے پاس تشریف لے گئے، اور فرمایا ''تم لوگوں نے ابھی ایسا ایسا کہا ہے؟ وہ کہنے لگے ''اے اللہ کے نبی، ہم تو محض خوش طبعی کے بطور اور مذاق کے مارے کہہ رہے تھے۔

دیکھئے زبان پر کچھ ہے اور دل میں کچھ، دل میں تو وہ تھا جو اپنے دوستوں میں کہہ رہے تھے ،ایر جو اهذاالر جل جیسے الفاظ سے (معاذ اللہ) آقا کو یاد کر رہے تھے، مگر آپ کے سامنے زبان پر یا نبی اللہ کا خطاب دے رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ظاہری اعتقاد اور

باطنی بداعتقادی یہ منافق کی صفت ہے، آج مشائخ کے یہاں جانے والوں میں سے کتنے ہیں جو ظاہر کے مطابق اپنا باطن بنا کر ان کی خدمت میں جاتے ہیں؟

تصدیق جو آج بھی طریق کی پہلی شرط ہے ہر زمانے میں اصل ہی رہی ہے، اسلام کی اصل بھی تصدیق ہی ہے، تو دل کی تصدیق کے بغیر زبانی اعتقاد کا مدعی ہونا، اور اس کی وجہ سے دوسروں پر اپنا امتیاز قائم کرنا، مشائخ کے یہاں جا کر ان کو ہنس ہنس کے دیکھنا، گردن ہلا ہلا کر ان کی باتوں کو سننا، کب سے تصدیق شمار کی جانے لگی ہے؟ اور طریق میں یہ امور کہاں سے داخل ہو گئے ہیں؟

کیا دل کی تصدیق کے ہوتے ہوئے انکار و اعتراض کا بھی کوئی شائبہ پایا جا سکتا ہے؟ اگر انکار یا اعتراض ہو تو سمجھ لیجئے کہ قلبی تصدیق ہی حاصل نہیں ہے، اس پر حدیث شریف کا ایک واقعہ اور سن لیجئے!

اونٹنی اور منافقین

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی غزوہ میں تشریف لے گئے، وہاں کسی شخص کی ایک اونٹنی گم ہو گئی، لوگوں نے ہر چند تلاش کیا مگر نہیں ملی، اس پر ایک منافق نے اعتراض و انکار کے طور پر کہا، یہ تو اپنے کو اللہ کا نبی کہتے ہیں، بتلا کیوں نہیں دیتے کہ وہ اونٹنی کہاں ہے؟ اس بات کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ بھائی میں اس بات کا دعویٰ کب کرتا ہوں کہ غیب کی سب باتوں کا مجھے علم ہے؟ اگر میں غیب جاننے کا دعویٰ کرتا تو مجھ سے اس قسم کی بات کہہ سکتے تھے، لیکن میں تم کو خبر دیتا ہوں کہ وہ اونٹنی فلاں جھاڑی کے پاس کھڑی ہے، وہاں ایک خاردار درخت کے کانٹوں سے اس کی مہار الجھ گئی ہے جس کی وجہ سے وہ وہیں ٹھہری ہوئی ہے،، لوگ اس پتہ پر گئے تو تو جا کر دیکھا کہ جس طرح سے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا ٹھیک اسی طرح وہ اونٹنی وہاں کھڑی ہوئی تھی، اس کو لے آئے۔ یہ واقعہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک زمانہ کا تھا، لیکن آج بھی ان منکرین ومعاندین کا مشائخ کے ساتھ بالکل وہی برتاؤ ہے جو اس زمانہ میں منافقین کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا کہ انکار کرتے ہیں اور حقیقت حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں، تب بھی تصدیق نہیں کرتے، میں تلاش میں تھا کہ اس واقعہ کے بعد اس منکر کا کیا بنا؟ پھر بھی ایمان لایا کہ نہیں؟ تو کسی کتاب میں دیکھا کہ پھر وہ ایمان لے آئے اور نفاق سے توبہ کر کے مخلص مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ایک غلط فہمی

ایک وجہ تو مشائخ سے نفع نہ ہونے کی یہ تھی، جس کا ذکر ہوا، دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں نے بالخصوص اہل علم حضرات نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تصوف کی تمام باتیں تو علماء ومشائخ نے کتابوں میں لکھ دی ہیں، وہی ہمارے لئے کافی ہیں، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بذات خود کتابوں کا مطالعہ کر کے سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں، ہمیں اب مشائخ کے یہاں جانے کی کوئی حاجت ہی نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ وہ عظیم نقصان ہے جو کتابوں سے پہنچا ہے، حالانکہ جہاں ان حضرات نے اپنی کتابوں میں تصوف کے مسائل لکھے ہیں وہیں اس کی تصریح بھی فرمادی ہے کہ یہ کتابیں شیخ کے لئے ہیں مرید کے لئے نہیں، جس طرح طب کی کتابیں طبیب کے لئے ہیں مریض کے لئے نہیں، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض حضرات نے تو یہاں تک بھی لکھ دیا ہے کہ ہماری ان کتابوں کو کوئی نااہل نہ دیکھے۔ چنانچہ ان حضرات نے اپنی اصطلاحات الگ مقرر کیں جنکے پردے میں کلام کیا، یہ سب کچھ اسی لئے تھا تاکہ ہر کس وناکس انکے مطالعے کی ہوس ہی نہ کرے، مگر باوجود ان سب

احتیاط وانتظامات کے لوگوں نے ان کتابوں کو دیکھا اور بہت سے لوگ تو محض کتابوں کی ہی مدد سے شیخ بن بیٹھے، اوران کے اس کام کا نقصان مشائخ اور مریدین دونوں طبقوں کو پہنچا۔

مریدین کا نقصان تو ظاہر ہے کہ جب ایسے لوگ مشیخیت کا دعوی کرنے لگے اور شیخ ہونے سے پہلے ہی شیخ بن بیٹھے، تو مریدین کی تو لٹیا ہی ڈوب گئی، اب ان کا انجام ہلاکت کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟

لیکن مشائخ کا نقصان یہ ہوا کہ عام لوگ ایسے ایسے لوگوں کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر ان سے بدظن ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ عام مشائخ بلکہ طریق کے بھی منکر ہو گئے، جس کے بعد اہل حق کو اپنا اعتبار قائم کرنا مشکل ہو گیا، اوراس کی وجہ سے ہدایت واصلاح کے سلسلے میں جو رکاوٹ اور تنگی پیدا ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔

کیفیات کا ذمہ دار

اسی طرح شیخ سے نفع نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگ اپنے اندر کیفیات پیدا ہونے یا نہ ہونے کا ذمہ دار شیخ کو سمجھتے ہیں، جو سراسر غلط اور باطل خیال ہے، کیونکہ کیفیات کا ذمہ دار خود مرید ہے، یاد رکھنا چاہئے کہ بدن کی بیماری اور روحانی یا باطنی بیماری اوران کے علاج میں فرق ہے، جسمانی بیماری میں تو معالج (علاج کرنے والا) اور ہوتا ہے اور معائج (اسکے علاج پر اعتماد کر کے نفع اٹھانے والا) دوسرا ہوتا ہے، مثلاً وہاں معائج مریض ہوتا ہے اور معالج طبیب ہوتا ہے، لیکن طریق یعنی اصلاحِ باطن کے معاملے میں معالج اور معائج دونوں ایک ہی شخص ہوتا ہے، یعنی نفس ہی معائج ہوتا ہے اور وہی اپنا معالج بھی ہوتا ہے، اوراس ایک ہی ذات کے معالج اور معائج ہونے میں صرف اعتباری فرق ہے

یعنی نفس میں چونکہ دوقوتیں ہوتی ہیں ،فعلیہ اور انفعالیہ،تو اول کے اعتبار سے تو وہ معالج ہوتا ہے (کہ وہ اپنی اصلاح کے لئے شیخ کے بتائے ہوئے علاج کو اپنے اندر جاری کرتا ہے)اور ثانی کے اعتبار سے وہی معالج ہوتا ہے (کہ شیخ کے بتائے ہوئے افعال واعمال پر اعتماد کے ساتھ عمل کر کے اس سے نفع اندوز بھی خود ہی ہوتا ہے)اس مضمون کو حضرت حکیم الامتؒ نے اپنی کتاب ''ظہور العدم بنور القدم'' میں ایک مقام پر ضمناً بیان فرمایا ہے ، چنانچہ بطور مثال فرماتے ہیں کہ جیسے اپنے نفس کے معالجات نفسانیہ (جسمانی امراض)میں معالج اور معالج کا تغائر (فرق) ہے (کہ دونوں الگ الگ ہوتے ہیں) پھر اس کے کچھ دور بعد کسی کا قول نقل کیا ہے:

إن الأمر فيما نحن ليس كما في المعالج و المعائج حيث يوخذ في الأول حيثية القوة الفعلية و في الثاني حيثية القوة الإنفعالية★

معاملہ اس بارے میں ویسا نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر معالج (بیمار)اور معالج میں ہوتا ہے، اول الذکر میں نفس قوت فعلیہ (حاکم) کے بطور کام کرتا ہے اور ثانی میں قوت انفعالیہ (محکوم) کے بطور۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ معالجۂ نفس (نفس کے علاج میں)نفس ہی معالج ہوتا ہے اور نفس ہی معالج ہوتا ہے، اسی سے ثابت ہوا کہ معالجۂ نفس خود مرید ہی کے ذمہ ہے، رہا شیخ، تو اگر وہ صاحب تصرف ہے (شیخ کے لئے ایسا ہونا ضروری نہیں) تو اپنے تصرف کے ذریعہ، ورنہ اپنی تعلیم وتربیت کے ذریعہ علاج کا جو طریقہ تلقین فرمائے یہ محض اس کا تبرع (ان کی طرف سے بطور احسان کے اپنی ذمہ داری سے بڑھ کر کام انجام دینا) ہے، اصلاح کا اصل ذمہ دار مرید ہی ہے، احوال وکیفیات کی تحصیل کے لئے اسی کو کام کرنا ہوگا۔

جہالت یا ہوشیاری؟

آج طریق کے متعلق جہاں اور بہت سی جہالت اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں نے نفع کا ذمہ دار شیخ کو قرار دے لیا ہے، اور میں تو کہتا ہوں کہ یہ ان کی جہالت یا غلط فہمی نہیں ہے بلکہ مریدین کی ہوشیاری ہے، کہ خود تو کچھ کرنا دھرنا نہیں چاہتے، بس یہ چاہتے ہیں کہ پکا پکایا مل جائے۔

ان کا یہ خیال بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل کے آزاد خیال لڑکوں کا، جو یہ چاہتے ہیں کہ نکمے اور کاہل ہو کر پڑے رہیں، زیادہ سے زیادہ دوست احباب کے ساتھ رہ کر ادھر اُدھر کی لغویات میں وقت گذاریں، بوڑھے باپ کی کمائی کھاتے رہیں، وہ بے چارے ان کو کما کما کر دیتے رہیں اور یہ من مانا خرچ کرتے رہیں، اور اگر وہ کچھ کہے تو اس کے پورے مخالف ہو جاتے ہیں۔

آج کل کے مرید بھی شیخ سے نفع تو حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اگلے زمانے کے مریدوں نے کیسے کیسے مجاہدے کئے، اور اپنے شیخ کے ساتھ کیسی محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا، تب جا کر ان کو کچھ ملا، آج کل کے مرید نفع تو انہیں جیسا چاہتے ہیں مگر محنت اور مجاہدے سے جی چراتے ہیں اسی کو میں ہشیاری کہتا ہوں، آپ اس کو ہشیاری کہئے یا ناواقفیت، بہرحال یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مرید کے احوال اور کیفیات کا ذمہ دار شیخ ہے، یہ سب چیزیں اعمال اور افعال کے تابع ہوتی ہیں، جیسا عمل ہوگا ویسا ہی نفع ہوگا، اگر نفع حاصل کرنا ہے تو مرید ہی کو کام کرنا ہوگا، بداخلاقیوں کو چھوڑنے کے لئے مجاہدہ بھی کرنا پڑیگا، اور اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق اور محبت پیدا کرنے کیلئے ذکر و فکر بھی کرنا ہوگا، باقی کرنا ورنا خاک نہیں اور ادھر اُدھر کی بے کار باتیں بنانا اور بہانے اختیار کرنا اس سے کچھ نفع حاصل

نہیں ہوتا، دنیا وآخرت میں کام آنے والی چیز اپنا حسنِ اخلاق اور حسنِ عمل ہے اسی کو خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

کامیابی تو کام سے ہوگی　　نہ کہ حسن کلام سے ہوگی
فکر اور اہتمام سے ہوگی　　ذکر کے التزام سے ہوگی
کارکن کار بگذر از گفتار　　کاندریں راہ کار باید کار

کام کر کام! باتیں بگھارنا چھوڑ، کہ اس راہ میں کام چاہئے کام!

بس اب اس دعا پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں

اللهم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه والباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه اللهم أرنا الأشياء كما هي اللهم اهدنا واهد بنا (وأقول كما) قال مولانا الرومي رحمۃ اللہ علیہ في دعائه:

لاتزغ قلباً هديت بالكرم　　واصرف السوء الذي خط القلم

اے اللہ ہمیں حق کو حق دکھایئے اور اس کی اتباع کی توفیق دیجئے، اور باطل کو باطل دکھایئے اور اس سے بچنے کی توفیق عنایت فرمایئے، اے اللہ ہمیں چیزوں کو ایسی ہی دکھایئے جیسی وہ ہیں، اے اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمایئے اور ہمارے ذریعے دوسروں کو بھی ہدایت دیجئے (پھر اسی طرح کہتا ہوں جیسے) مولانا رومیؒ نے اپنی دعا میں کہا ہے:

میرے دل کو میلا نہ فرمایئے جبکہ آپ نے اس کو اپنے کرم سے ہدایت عطا فرمائی ہے، اور مجھ سے ان برائیوں کو بھی دور فرما دیجئے جن کو قلم نے لکھ دیا ہے۔ آمین

ارشادالحیران،معروف بہ تلاش مرشد

نحمدہ وصلی علیٰ رسولہ الکریم

اللہ تعالیٰ کی طلب

اللہ تعالیٰ کی طلب اس دار دنیا میں ایمان کے لوازم میں سے ہے (یعنی ایمان ہے تو اس کا ہونا بھی ضروری ہے) جس قدر ایمان ہوگا اسی قدر یہ طلب بھی ہوگی، اور جس طرح سے طلب ایمان کے لوازم میں سے ہے اسی طرح حیرانی (اللہ تعالیٰ کی جستجو میں پریشان ہونا) اور سرگردانی (مارے مارے پھرنا) طلب کے لوازم میں سے ہے، چنانچہ **ووجدک ضالا فھدیٰ** ★ کی ایک تفسیر حیرانی سے بھی کی گئی ہے، میں نے حضرتؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اسکو صوفیا اپنے کلام میں حیرت سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ حیرت محمود ہے۔

حیرت کی دو قسمیں

صوفیا کے یہاں حیرت کی دو قسمیں ہیں ایک محمود ہے اور دوسری مذموم، محمود تو یہی ہے جو بیان ہوئی، اور مذموم یہ ہے کہ انسان کو محبوب کی طلب سے غفلت ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ راستے کو چھوڑ دیتا ہے، اور راستے کو چھوڑ دینے کے لئے بھی حیرانی وسرگردانی لازم ہے، جس کے سبب وہ حیران رہتا ہے یہ حیرانی مذموم ہے اور یہ تمام دنیا داروں کو حاصل ہوتی ہے بلکہ انکے ساتھ ہمہ وقت چپکی رہتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مستقل مرکز یعنی اللہ تعالیٰ سے ہٹ جاتے ہیں، اور پھر ان کا کوئی مستقل مرکز نہیں رہ جاتا، یہی ان کی حیرانی و پریشانی کا سبب بنتا ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہے نہ دل کے لئے کوئی مستقل مرکز
یہی ہے عقل تو دل اس سے دور ہی اچھا

اورایک حیرانی اللہ تعالیٰ کی طلب میں ہوتی ہے، جوتمام انبیاعلیہم السلام،مومنین اورصالحین کوحاصل ہوتی ہے کیونکہ ادھر کا راستہ اس قدر وسیع ہے کہ یہ حضرات اس میں حیران رہ جاتے ہیں اور یہ حیرانی کیوں نہ ہو، یہ راہ بھی تو کس کی ہے؟ یہ محبوبِ حقیقی کی راہ ہے،اس راہ میں جب کسی کو ذراسی معرفت حاصل ہوجاتی ہے تو بس وہ حیران رہ جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض بعض اسی مرتبہ میں مجذوب ہوجاتے ہیں،بس اسی حیرانی میں کبھی ان حضرات سے بظاہر کچھ خلاف اورخطا کا صدور بھی ہوجاتا ہے لیکن یہ مذموم نہیں۔

چنانچہ حضرت امیر خسروؒ جوحضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خلفا میں سے ہیں فرماتے ہیں :

حیراں شدم درآرزویت　　اے چشمِ جہانیاں بسویت

میں تیری آرزو میں حیران ہوگیا ہوں،اے وہ ذات کہ پوری دنیا کی نگاہیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

ایم.....وتحیر...وخموشی　　آفاق ہمہ بگفتگویت

ہم ہیں اور حیرانی وخموشی ہے،اورتمام جہاں آپ کی گفتگو کررہا ہے۔

خسروبکمندتواسیراست　　بیچارہ کجا دورزکویت

خسروآپ کی کمند میں قید ہے، بے چارہ آپ کا در چھوڑ کر کہاں جائے؟

اورمولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

کاملاں کزسرِتحقیق آگہند　　بےخودوحیران ومست ولالہ اند

کاملین ،جوحقیقت کے راز سے واقف ہیں، بےخود ہیں ،حیران ہیں ،اور اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت دیکھ دیکھ کرمست ہورہے ہیں۔

نے چنیں حیراں کہ پشتش سوئے دوست

بل چنیں حیراں کہ غرق ست دوست

لیکن ان کی یہ حیرانی اس شخص کی طرح کی نہیں کہ جس کی پشت دوست کی طرف ہو اور وہ اس سے غافل اور محجوب (پردے میں) ہو بلکہ وہ تو دوست کے دیدار کی مستی میں چور ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کی حیرت مذمومہ نہیں بلکہ محمودہ ہے، اس کے بعد حیرت محمودہ کے دو مرتبے بتلاتے ہیں:

آں یکے را روئے او شد سوئے دوست

ویں یکے را روئے او خود روئے دوست

ایک متحیر تو وہ ہے کہ دوست کی جانب اس کی توجہ ہے، اور دوسرا ایسا ہے کہ اسکی توجہ بالکل دوست کی توجہ ہے:

(اس دوسرے مصرعے کی تفسیر حضرت بھلّے شاہ کا یہ شعر خوب کرتا ہے،

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی

سیدو نی میں نوں دھیدو رانجھا، ہیر نہ اکھے کوئی

رانجھا رانجھا رانجھا کرتے کرتے میں خود ہی رانجھا ہوگئی ہوں، ایری سکھیو! مجھے رانجھا کہہ کے پکارا کرو! خبردار اب مجھے کوئی ہیر نہ کہیو!

اس حیرانی کا بیان کرنا کچھ آسان نہیں، یہ وہ حیرانی ہے جو محبوب حقیقی کی طرف سے پیش آتی ہے، اور ہر ایک کو اس کے حال کے مطابق پیش آتی ہے، وہ غنی ہیں طالب سے بھی اور طالبین کی طلب سے بھی، اس لئے اپنے طالبین سے بھی غنا ظاہر کرتے ہیں، پھر جب

محبوب ہی غنا (لا پرواہی، بے نیازی) ظاہر کرے تو ایک طالب ومحب بے چارہ کیا کرے؟ اور کہاں جائے؟ حیران وششدر رہ جاتا ہے اور بالکل ایسا ہو جاتا ہے:

دیدار می نمائی و پرہیز می کنی　　بازارِ خویش آتشِ ما تیز می کنی

دیدار بھی کراتے ہیں اور پرہیز بھی کرتے ہیں، اپنی تجلیاں تیز تر کئے جاتے ہیں اور ہماری آتشِ شوق کو بھی بھڑکائے جاتے ہیں۔

بے نیازی، تری عادت ہی سہی

محبوب کے لئے تو یہ بے نیازی لازم ہے جیسے عاشقوں کے لئے نیاز وطلب لازم ہے، وہ اپنے عشاق کا اسی میں امتحان کرتے ہیں:

مزہ آتا ہے ان کو چھیڑنے میں اپنے عاشق کو
کبھی مسرور کرتے ہیں کبھی رنجور کرتے ہیں

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

سالکین کو قبض (تنگی، طاعات میں دل نہ لگنا) پیش آنے کی یہی وجہ ہے، حیرانی اس طریق کے لوازم میں سے ہے، تو ہر طالب میں اس کا کم یا زیادہ ہونا ضروری ہے، اسی لئے کسی طالب کو جب کوئی اصول یا طریقہ سمجھایا جائے گا تو بصیرت حاصل ہونے سے پہلے (معاملہ واضح ہو کر سمجھ میں آنے سے پہلے) وہ کسی اصول پر نہیں رہیگا الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی اس پر ہو جائے، اور وہ اپنی طلب کے امتحان میں کامیاب ہو جائے تو بات الگ ہے۔

اس میں سب سے مفید چیز ان حضرات کا اتباع ہے جو ان حالات سے گذر چکے ہیں، جو لوگ ان گھاٹیوں سے پار ہو چکے ہیں وہی دوسروں کو ان گھاٹیوں سے نکال سکتے ہیں، انہیں سے کچھ راستہ مل جائے تو مل جائے، لیکن اعمال کی خرابی کی وجہ سے آج اہل اللہ پر ہی اعتماد نہیں رہا، اس لئے کہ اس جماعت میں بہت سے ایسے لوگ داخل ہو گئے ہیں جن سے لوگوں کا اعتماد اٹھ چکا ہے، لہذا اب وہ کسی کا بھی اعتبار نہیں کرتے۔

ہماری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہے کہ زمانہ بے دینی کا ہے اول تو لوگوں کو دین کا خیال ہی نہیں، اگر کسی کو کچھ خیال ہے بھی تو وہ اہل اللہ اور بزرگ کے انتخاب میں ہی حیران و پریشان رہ جاتا ہے، اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کس کے پاس جائے اور کس کے پاس نہ جائے، اور اس میں وہ کسی قدر معذور بھی ہے۔

شیخ کامل کے حصول کیلئے مناجات

لہذا اب اس حال میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جس کی راہ میں قدم رکھنا چاہتا ہے، اسی سے التجا کرے اور اپنی کوشش پر بالکل اعتماد نہ کرے، کیونکہ اب اس زمانے میں جبکہ رہبر اور رہزن باہم مخلوط ہو گئے ہیں تو کس پر اعتماد کیا جائے اور کس کا اعتبار کیا جائے، لہذا اب طریق یہ ہے کہ دعا جو ''سمجھ بوجھ (ایک کتاب کا نام) کے حاشیہ پر لکھی ہے، اس پر عمل کرے جس کا حاصل یہ ہے کہ جناب باری میں صدق و خلوص کے ساتھ خوب ایحاح و زاری کرے اور دو ایک بار نہیں بلکہ ایک مدت تک اس کا معمول رکھے، وہ دعا یہ ہے:

کہ اے معبودِ برحق اے مرے رب
کوئی بندہ جو ہو تیرا مقرب
بس اس عاصی کو تو اس سے ملادے

جمالِ پاک تو اس کا دکھادے
کہ میں صحبت سے اس کی بہرہ ور ہوں
وسیلے سے بس اس کے تجھ کو پاؤں

انشاء اللہ تعالیٰ مطلوب حقیقی اپنے طالب کی مدد فرمائیں گے اور اس کی طلب کو ضائع نہ کریں گے، کوئی اللہ کا بندہ اس کو مل ہی جائیگا، اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے۔

اس سے بڑھ کر اور اس سے بہتر اس زمانے میں طالبینِ حق کے لئے اور کوئی طریقہ نہیں جو بے خطر ہو کیونکہ بزرگان دین نے اور طریقے بھی لکھے ہیں، مگر ان میں طالبین کو کچھ اشکال (اندیشہ) ہو جاتا ہے، کچھ تو بصیرت کی کمی کی وجہ سے اور کچھ طلب کی کمی کی وجہ سے، لیکن یہ طریقہ جو میں نے ابھی بتایا ہے، سمجھ بوجھ کے بتایا ہے، اور یہ طریقہ اللہ تعالیٰ سے استخارہ کا ہے، جو کہ ایسے امور میں مسنون ہے، چونکہ اس میں کامیابی کا وعدہ ہے، لہذا انشاء اللہ کامیابی یقینی ہے، اس مناجات کی یہ جو تاثیر بیان کی گئی کہ کسی بزرگ تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ نکل آئے گا، اور کسی اللہ کے بندے سے ملاقات ہو ہی جائے گی، اس کے متعلق ایک واقعہ سنئے:

مناجات کی تاثیر کا واقعہ

''ہمارے قبلہ وکعبہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے حضرت حاجی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک بزرگ کے ہاتھ میں دیدیا، جس سے حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ سمجھا کہ اشارہ اس طرف فرمایا جارہا ہے کہ ان سے بیعت ہوں اس سے آپ کو اس کا علم تو ہو گیا کہ مجھ کو ان سے استفادہ کرنا چاہئے، لیکن ان بزرگ کا پتہ ونشان کچھ معلوم نہ ہوا کہ کہاں ہیں کون ہیں؟ قریب ہیں یا دور ہیں، ایک

بار حضرت کا جلال آباد جانا ہوا، وہا کوئی بزرگ تھے جو حضوری کہلاتے تھے، یعنی ان کو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوتی تھی، ان سے اس خواب کا ذکر کیا، انہوں نے فرمایا کہ ذرا ''لوہاری'' تو جا کر دیکھو!

لوہاری میں اس وقت ایک بزرگ رہتے تھے، جو بچوں کو قرآن شریف وغیرہ پڑھایا کرتے تھے، عام طور پر لوگوں کو ان کی جانب کوئی خاص توجہ نہ تھی، حضرت حاجی صاحبؒ لوہاری تشریف لے گئے، جا کر دیکھا تو بالکل وہی شکل پائی جو خواب میں دیکھی تھی، دیکھتے ہی قدموں پر گر پڑے، ابھی حاجی صاحب نے کچھ کہا بھی نہیں تھا کہ حضرت میانجیؒ نے فرمایا کہ میاں خواب وخیال کا کیا اعتبار ہے؟

حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ حضرت مجھے بیعت فرمالیجئے، فرمایا اچھا جاؤ وضو کر کے آؤ، اس کے بعد بیعت فرمالیا۔

مناجات کی تاثیر کا دوسرا واقعہ

اسی طرح اس مناجات کی تاثیر کا دوسرا واقعہ سنئے:

ایک صاحب تھے محمد قاسم نیانگری، جو پہلے ایک شیخ حاجی محمد امیر علی صاحب سے بیعت تھے لیکن ان سے طریق کا کچھ نفع نہ ہوا تھا کہ وہ بزرگ کہیں لاپتہ ہو گئے تھے، اس لئے وہ کسی دوسرے شیخ کو تلاش کرنے لگے، چنانچہ وہ اپنا واقعہ خود لکھتے ہیں کہ سلوک کے چند رسالے مثلاً،، القول الجمیل، ترجمہ شفاء العلیل، معمولات مظہریہ، اور سمجھ بوجھ وغیرہ اس عاجز کے مطالعے میں آئے، ان کے مطالعے سے طبیعت میں کچھ شوق پیدا ہوا مگر جب کسی بات کا مطلب معلوم نہ ہوتا تو دل گھبرانے لگتا، تو جو دعائیہ اشعار سمجھ بوجھ کے حاشیہ میں لکھے ہیں اور متن میں جو سات مرتبہ الحمد پڑھنے کا طریقہ لکھا ہے اس پر ایک مدت تک عمل

کیا، اس کا یہ اثر ہوا جو دلی محبت حضرت مرشدنا مولانا حافظ حاجی محمد یعقوب صاحبؒ سے تھی اس کا اثر ہونے لگا، اور حضرت کی محبت کا جوش میرے دل میں بڑھنے لگا، اور اتنا غلبہ ہوگیا کہ حضرت ہر وقت (بنا موجود ہوئے) نگاہ کے سامنے رہنے لگے، اور کئی مرتبہ خواب میں زیارت، اور قدمبوسی حاصل ہوئی۔[1]

اس کے بعد ایک حدیث ملی اس میں بھی اسی قسم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ راوی نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ کسی جلیس صالح سے ملاقات ہوجائے تو انکی ملاقات حضرت ابو ہریرہؓ سے ہوئی، چنانچہ ترمذی شریف کی حدیث ہے حضرت حریث بن قبیصہؒ جو راوی حدیث ہیں اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جب میں مدینہ حاضر ہوا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے کوئی نیک ہم نشین عنایت فرما، چنانچہ میری ملاقات حضرت ابو ہریرہؓ سے ہوئی، میں نے ان سے عرض کیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ مجھے کوئی جلیس صالح (نیک دوست) عطا فرما تو آپ مجھ سے ملے ہیں، لہٰذا مجھے کوئی ایسی حدیث سنا دیجئے جسے آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہو، شاید اللہ تعالیٰ مجھ کو اس سے نفع عطا فرمادے۔

اس پر انہوں نے یہ حدیث سنائی، فرمایا: ''قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سب سے پہلے جس چیز کا حساب ہوگا وہ اس کی نماز ہوگی، اگر یہ درست ہوگئی تو یہ شخص کامیاب ہو گیا اور جس کی نماز کا حساب صاف نہ ہوا وہ نقصان اور خرابی میں پڑا، پھر اگر اس کے فریضے میں کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو، میرے بندے کے پاس کوئی نفل عبادت بھی ہے؟ اگر ہوئی تو اس سے اسکے فریضے کی تکمیل کردی جائے گی، پھر اسکے باقی اعمال بھی اسی طریقے پر ہونگے۔

---

[1] مکتوبات یعقوبیہ ص ۷

دیکھئے ان واقعات سے معلوم ہوا کہ جس کیلئے جہاں سے کسی دولت کا حصول اور استفادہ لکھا ہوتا ہے تو اللہ کی طرف سے اسکے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں، طالبین کو یہ سمجھنا نہایت ضروری ہے، اس لئے بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے، اسی سے کامیابی ہوتی ہے۔

برا خیال

یہ خیال کرنا کہ دنیا بزرگوں سے خالی ہو چکی ہے اور اب اہل اللہ اور کاملین موجود ہی نہیں ہیں یہ تو بہت ہی برا خیال ہے، اور غلط بھی ہے، کیونکہ اہل اللہ ہر زمانے میں رہے ہیں اور رہیں گے چاہے کم رہیں یا زیادہ مگر دنیا کبھی ان سے خالی نہ رہے گی، البتہ یہ فرق ہے کہ پہلے زیادہ ہوتے تھے اور اب کم ہوتے ہیں۔

پس جب کسی کا اہل اللہ میں سے ہونا ثابت ہو جائے گا تو اس کا اعتقاد اور اس کی عظمت ضروری ہوگی، اور اس طریق میں جس طرح اعتقاد ضروری ہے، کہ بغیر اسکے نفع نہیں ہوتا، اسی طرح کسی کامل کے انکار سے نقصان بھی ہوتا ہے، اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کہیں کسی شیخ کے پاس جانے سے پہلے اسکی عظمت اور اسکا اعتقاد اپنے دل میں خوب پیدا کر لے، تب جائے، کیونکہ تحقیق (دیکھ بھال کرنے اور پرکھنے) کا وقت شروع میں ہی ہے،، کسی کو دلیل کے ساتھ کامل ماننے میں اگر کچھ زمانہ بھی لگ جائے تو حرج نہیں، بعض لوگوں نے شیخ سے بیعت ہونے سے پہلے دس دس سال صرف کر دئے، لیکن جب دلیل اور برہان سے کسی کو مان لے تو پھر اپنی چھان پھٹک کو ایک طرف رکھ دے، اور اسکی پیروی کرے، اس کے سامنے بچھ جائے۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ انسان کو شیخ کا انتخاب کرنے میں تو خوب چھان بین کرنی چاہئے، لیکن جب شیخ کو چن لیا اور اس سے بیعت ہو گئے تو اس کے بعد پیروی ہی کرنی چاہئے۔

آج لوگوں نے ان دونوں ہی باتوں کو چھوڑ دیا ہے، پہلے تحقیق نہیں کرتے (جس کے پیچھے بھیڑ دیکھی اسی کے پیچھے لگ لئے) اور جب تقلید اور پیروی کا وقت آجاتا ہے تو وہاں تحقیق شروع کر دیتے ہیں۔

شیخ کامل کے حصول کا دوسرا طریقہ

جس طرح اس کا ایک طریقہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہے، تو دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کا صادق ہونا اس کے نزدیک مسلم ہو ان سے پوچھ لے، اور جب کوئی صادق کسی کی تصدیق کر دے اور اپنا دل بھی مطمئن ہو جائے، تو اسکے بعد اس کا ماننا ضروری ہے، کیونکہ شہادت کے معاملے میں گواہ کے عادل ہونے کا تو لحاظ کیا جائیگا، لیکن کسی عادل کی شہادت کے بعد پھر اسکا خلاف نہیں کیا جا سکتا، ورنہ تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ شہادت تو کوئی چیز ہی نہ ہوئی، اسکا مطلب شہادت کا دروازہ بند کرنا ہوگا، حالانکہ دین و دنیا کے کتنے معاملات ہیں جو شہادت پر موقوف ہیں، حقوق کا ثبوت شہادت سے ہوتا ہے، چاند دکھائی دینے کے سلسلے میں شہادت کا اعتبار کیا جاتا ہے اور اس سے صوم وعید کی تحقیق ہوتی ہے، تو جب ان تمام امور میں شہادت معتبر ہے تو شیخ کے معاملے میں کیوں معتبر نہ ہوگی؟

آج جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی اہل اللہ کی شناخت اگر تم کو از خود حاصل نہیں تو دوسرے نیک لوگوں سے معلوم کر لو، اور ان کی شہادت پر عمل کرو تو اس سے بدکتے ہیں، میرا خیال ہے کہ اس کا سبب جہالت ہے، کلام کا حاصل یہ ہے کہ شہادت کے بعد اس کا ماننا ضروری ہے، اب اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہے اور اسکے نصیب میں ہے تو اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا ورنہ چونکہ شیخ صادق ہے اس لئے خود ہی کہدیگا کہ تم فلاں کے یہاں جاؤ، تمہارا حصہ یہاں نہیں ہے، چنانچہ ہر زمانے میں بزرگان دین نے ایسا ہی کیا ہے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ نے بیان فرمایا ہے کہ ایک بزرگ تھے مولانا محمد جان صاحبؒ جو جبل ابوقبیس (مکہ کے ایک پہاڑ کا نام) پر رہتے تھے، میں نے ان کی زیارت کی ہے، وہ کہتے تھے کہ میں اور تمہارے دادا پیر حاجی عبدالرحیم صاحب دونوں پہلے مولانا عبدالباری صاحب امروہوی کے پاس گئے، ایک دن مثنوی کے مطالعے سے ان پر کوئی خاص کیفیت طاری تھی تو مجھ سے فرمایا، کہ تمہارا حصہ مولانا غلام علی صاحب دہلویؒ کے یہاں ہے وہاں چلے جاؤ، یہاں تم کو فائدہ نہ ہوگا اور حاجی عبدالرحیم صاحب کو اپنے پاس رکھ لیا۔

اسی طرح ایک اور واقعہ ایک اور بزرگ کا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد جب ان کے بیٹے مسندِ خلافت پر بیٹھے، تو شیخ کے بڑی بڑے مریدین کو ان کی صغرسنی (عمر کم ہونے) کی وجہ سے ان سے فیض حاصل کرنے میں شرم سی محسوس ہوئی، چنانچہ وہ لوگ ایک دوسرے بڑے بزرگ کی خدمت میں چلے گئے، لیکن انہوں نے ان کو واپس بھیج دیا کہ تم لوگوں کا حصہ وہیں ہے، وہیں جاؤ، تو وہ واپس آئے اور نفع ہوا۔

اسی سلسلے کا ایک اور واقعہ سنئے، کانپور میں ایک بزرگ مولوی غلام حسین صاحب تھے، میں بھی ان سے ملا ہوں، اچھے بزرگ تھے وہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے تھے کہ میں مکہ میں حضرت حاجی (امداداللہ) صاحبؒ کی خدمت میں استفادہ (فائدہ حاصل کرنے) کیلئے حاضر ہوا کرتا تھا، اسی دوران مکہ معظّمہ میں مجھے ایک بزرگ ملے، انہوں نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ حضرت حاجی صاحبؒ اپنی نسبت کا القا تمہارے اوپر کرتے ہیں لیکن فلاں بزرگ نقشبندی سلسلہ کے آکر اس کو روک دیتے ہیں (مطلب یہ تھا کہ تم کو اسی سلسلہ سے نفع پہنچے گا)

لہذا طالب کو چاہئے کہ جب کوئی صادق کسی کی بابت شہادت دے ،جس پر اپنا دل بھی مطمئن ہو جائے تو اس کے یہاں جائے اور عظمت وارادت کے ساتھ جائے اور اپنی ارادت میں صادق ہو۔

در ارادت باش صادق اے فرید
تا بیابی گنجِ عرفاں را کلید
بے رفیقی ہر کہ شد در راہِ عشق
عمر بگذشت ونشد آگاہِ عشق

اے فرید تم ارادت وعقیدت میں سچے بنو تا کہ عرفان کے خزانے کی کنجی پا سکو، جو شخص عشق کی راہ میں رہبر کے بغیر رہیگا اس کی ساری عمر گذر جائے گی لیکن عشق کی حقیقت سے نا واقف ہی رہے گا۔

طریق میں ارادت (فرمانبرداری) اور ارادت میں بصیرت یعنی یقین میں پختگی اصل چیز ہے اور یہی کامیابی کی کنجی ہے۔

شیخ کی ذمہ داری

اسی طرح شیخ کو بھی چاہئے کہ اگر اس کا حصہ اس کے یہاں نہیں ہے تو صاف کہدے کہ تم فلاں جگہ جاؤ، اور ان سے طریق حاصل کرو، اور جو کوئی سچا ہوگا وہ ایسا ہی کریگا کیونکہ اس کا تو مقصد کام ہوتا ہے اپنا نام کرنا نہیں ہوتا۔

میں محکم برہان اور دلائل پیش کر رہا ہوں اس پر کہ اہل اللہ کے تلاش کرنے کا طریقہ کیا ہے ؟اور اس کی جو دلیل بیان کی گئی ہے وہ ایسی مستحکم (مضبوط) ہے کہ کوئی اس کا رد اور انکار نہیں کرسکتا۔

مشائخ نے اس مضمون پر تفصیل کے ساتھ کلام فرمایا ہے، جس طرح تصوف کے دوسرے مضامین پر کلام کیا ہے اسی طرح اس پر بھی مفصل بحث فرمائی ہے، اور اس کو کسی کی عقل یا رائے پر نہیں چھوڑا ہے، اور نہ صرف اس زمانہ میں بلکہ اس سے پہلے بھی ہر زمانہ میں مشائخ نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور ہمیشہ اس پر کلام کرتے آئے ہیں، باقی میں نے اس وقت جو مختصر کلام کیا ہے وہ بھی بہت کافی وافی ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ جو ایک مانے ہوئے عالم، زبردست مفسر، مستند محدث، اعلیٰ درجہ کے فقیہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عارف کامل صوفی اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ بھی تھے، تصوف کے اپنے لاجواب رسالہ ''ارشاد الطالبین'' میں اسی سلسلے کا ایک شبہ جو ذہنوں میں عام طور پر پیدا ہوتا ہے اور اس کا محققانہ جواب تحریر فرماتے ہیں (ہم اس کے اردو ترجمہ سے اس سلسلے کی ضروری عبارتیں نقل کر رہے ہیں۔ع م)

کرامات

'' یاد رکھو (خدا تم کو سعادت بخشے) کہ خرقِ عادات (کرامتیں) ولایت کے لوازم میں سے نہیں بعض اولیاء اللہ اور مقربان الٰہی (اللہ والے) ایسے بھی ہیں جن سے کرامتیں ظاہر نہیں ہوئیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اکثر صحابہ سے کرامت ظاہر ہونا روایت نہیں کیا گیا، حالانکہ ادنیٰ صحابی بھی دیگر اولیاء اللہ سے افضل ہے، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور صاحب عوارف فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو کرامتیں دیتا ہے اور بعض کو نہیں دیتا، حالانکہ وہ صاحبِ کرامت سے افضل ہوتا ہے، اور کرامت دل کے ذکر اور اس کی اصلاح سے مرتبے میں کم ہے، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری نے فرمایا ہے'' عارفوں کی

فراست طالبوں (مریدوں) کی استعداد اور اولیا کے مقامات دریافت کرنے میں ماہر ہے اور اہلِ ریاضت (مادی چیزوں پر محنت کرنے والے) کی فراست شکلوں (مادی چیزوں) اور ان اشیا کے حالات دریافت کرنے میں مخصوص ہے جو نظر سے غائب ہیں، چونکہ اکثر لوگ دنیا میں مشغول ہیں اور خدا سے بے تعلق ہیں تو ان کے دل غائب اشیا کے حالات معلوم کرنے کی طرف زیادہ لپکتے ہیں، اور اس کو بہت عمدہ جانتے ہیں یہ لوگ اہلِ عرفان وحقیقت کے کشف سے کوئی کام نہیں رکھتے، اور کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ اہل اللہ ہوتے تو غیب کے حالات سے خبردار ہوتے، جب اتنی خبر ہی ان کو نہیں تو دوسری باتیں ان کو کیا معلوم ہونگی؟

کرامت ضروری نہیں

اسی طرح منافق لوگ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حق میں کہتے تھے، ایسے کمینے لوگ ان فاسد (برے) خیالات کیوجہ سے اللہ کے دوستوں کی برکتوں سے محروم رہتے ہیں، اور نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کے بارے میں غیرت رکھتا ہے، کہ ان کو اپنے سوا کسی اور طرف مشغول نہیں ہونے دیتا، اگر کوئی کہے کہ کرامتیں ولایت کی شرط نہ ہوں تو یہ کیونکر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ ولی اللہ ہیں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات کے دو جوابات دئے ہیں:

(۱) ولی کی ولایت کو معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ولایت خدا سے ایک نسبت ہے، کوئی اس سے مطلع ہو یا نہ ہو، اکثر اولیاء اللہ خود اپنی ولایت سے مطلع نہیں ہیں، دوسروں کا کیا ذکر ہے؟ موت کے بعد اس کا ثمرہ دیکھیں گے، خوارق عادات (عام عادت سے الگ ہٹ کر کوئی کام، کرامت یا معجزہ) کی ضرورت دراصل انبیاء کرامؑ کو ہے جو مخلوق کو دعوت

دیتے ہیں ضروری ہے کہ وہ مخلوق پر اپنی نبوت ظاہر کریں اور ثبوت مہیا کریں، اولیا جو دعوت دیتے ہیں تو اپنے پیغمبر کی شریعت کی وہی دعوت دیتے ہیں، اس پیغمبر کا معجزہ اس دعوت کے لئے کافی ہے، علماء وفقہا ظاہر شرع کی دعوت دیتے ہیں، اور اولیا مریدوں کو پہلے ظاہر شریعت کو بجالانے کی دعوت دیتے ہیں پھر ان کو ذکر سکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اپنے اوقات یادِ الٰہی میں صرف کیا کرو تا کہ ذکرِ الٰہی غالب ہو جائے اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کا خیال دل میں نہ رہے اور اس دعوت میں کرامت کی ضرورت نہیں۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ نیک مرید جوں جوں اپنے حالات میں تبدیلی دیکھتا ہے اپنی ہی ذات میں پیر کی کرامت اس کو دم بدم نظر آتی ہے جو مردہ دل کو زندہ کر کے مشاہدہ اور مکاشفہ (بعض غیبی امور کو دیکھنا، اور بعض پوشیدہ باتوں کو بنا کسی وسیلہ کے من جانب اللہ جان لینا) سے سرفراز کر دیتا ہے۔

مثلاً مردہ کا زندہ کرنا عوام کے نزدیک ایک عمدہ کام ہے، لیکن خواص کے نزدیک روح اور قلب کے زندہ ہونے کا اعتبار ہے نہ کہ جسم کے زندہ ہونے کا، بس کرامت مرید کی نظر میں موجود ہے (کیونکہ مرشد نے اس کی مردہ روح کو جلا بخشی ہے) اور عوام (جو مردے کے زندہ ہونے کو ہی کرامت سمجھتے ہیں، ان) کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے (کیونکہ ان کا اس ولی سے تعلق ہی کچھ نہیں)۔

تمام شد

وأخر دعوانا أن الحمد للہ رب العٰلمین